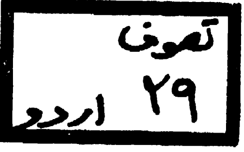
U1226



تصوف
۲۹

شرح اسرارِ خودی

ترجمانِ حقیقت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ کی شہرۂ آفاق
فارسی مثنوی اسرارِ خودی کے دقیق مطالب کی نہایت آسان شرح

پروفیسر محمد یوسف خاں سلیم چشتی بی۔اے (آنرز)

شرحِ اسرارِ خودی

یعنی

ترجمانِ حقیقت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے
نظریۂ خودی کی آسان فہم تشریح

مرتبہ

پروفیسر محمد یوسف خاں سلیم چشتی بی، اے (آنرز)

اقبال اکیڈمی۔ ظفر منزل۔ تاج پورہ لاہور

قیمت عہ/

تیری زندگی اسی سے تیری آبرو اسی سے
جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو روسیاہی

فہرستِ مضامین

مبحث پنجم

مبحث ششم

مبحث ہفتم

مبحث ہشتم

مبحث نہم

مبحث دہم

مبحث یازدہم

تتمہ

۱۹۶۲
۱۱۲۳۷

اقبال اکیڈیمی، ترجمانِ حقیقت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال علیہ الرحمۃ کی یادگار کے طور پر ۱۹۳۹ء میں وجود میں لائی گئی تھی۔ اس کے پیشِ نظر یہ چیز تھی کہ جس کام کے لئے علامۂ مرحوم و مغفور نے اپنی زندگی کو وقف کر رکھا تھا اُسے آپ کے بعد بھی جاری رکھا جائے۔ سرِ دست اتنا سامنے تھا کہ آپ کے نظریہ اور فلسفہ کی تشریح میں بلند پایہ اہلِ علم جو کچھ اُردو زبان میں تحریر فرمائیں اُسے نہایت عمدگی سے طبع کر کے نشر کیا جائے اور اِس طرح آپ کے تخیل اور کلام کو زیادہ سے زیادہ آسان بنانے کی کوشش کی جائے ۔

مجھے افسوس ہے کہ اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے باعث میں اس تمام پروگرام کو جو میں نے اِس کام کے لئے مرتب کیا تھا نباہ نہیں سکا۔ مگر ارادہ کر رہا ہوں کہ اگر اللہ تعالےٰ کی توفیق شاملِ حال ہوئی تو ۱۹۴۴ء میں اُس کا بہت سا حصہ سرانجام دے سکوں گا ۔

اب تک اس سلسلے کی صرف تین کتابیں طبع ہو سکی تھیں (۱) یادِ اقبال (۲) شرح اسرارِ خودی (۳) تعلیماتِ اقبال۔ اول الذکر دونوں کتابوں کا پہلا ایڈیشن ویسے ختم ہو چکا تھا۔ الحمد للہ کہ یہ دوسرا ایڈیشن بہت کچھ حذف و اضافہ کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ یادِ اقبال کا تازہ ایڈیشن بھی جلد طبع ہو جائے گا۔ علاوہ ازیں حسب ذیل نئی کتابیں طبع ہو چکی ہیں:

۱۔ اقبال کا تصوّرِ زمان و مکان: یہ کتاب جناب ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی ایم۔ اے، پی، ایچ، ڈی پروفیسر ریاضی جامعہ عثمانیہ کی تصنیف ہے۔

۲۔ موت و حیات، اقبال کے کلام میں: یہ کتاب بھی ڈاکٹر محمد رضی الدین صاحب صدیقی ہی کی تصنیف ہے۔

۳۔ اقبال کے چند جواہر ریزے: یہ کتاب خواجہ عبدالحمید صاحب پروفیسر گورنمنٹ کالج کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔

اقبال کے نام اور کام کو زندہ رکھنے کا بہترین طریق یہ ہے کہ آپ اقبال کے نظریہ کو سمجھیں اور دوسروں کو اس کے سمجھنے کی دعوت دیں اور اس سلسلے میں اقبال اکیڈیمی کے ساتھ جس طرح بھی تعاون کر سکتے ہوں اس سے گریز نہ کریں۔ فقط

خادم

سید محمد شاہ ایم۔ اے سکرٹری اقبال اکیڈیمی ظفر منزل

تاجپورہ —— لاہور

۲۰، دسمبر ۱۹۴۳ء

جس طرح بعض الفاظ کو محض اس لئے فصیح سمجھا جاتا ہے کہ وہ عوام میں رواج پا جاتے ہیں حالانکہ قواعدِ زبان کے لحاظ سے بالکل غلط ہوتے ہیں، اسی طرح بعض الفاظ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے معنی اور مفہوم کو محض اس لئے صحیح مانا جاتا ہے کہ کوئی مخصوص جماعت اپنے زاویۂ نظر کے مطابق اُن کی تشریح اُس انداز میں کر دیتی ہے حالانکہ اگر قدرے غور سے دیکھا جائے تو وُہ معنی اور مفہوم علمِ لغت کے خلاف ہوتے ہیں۔ خودی کے اس چہار حرفی لفظ کا شمار بھی مؤخرالذکر قسم کے الفاظ میں ہوتا ہے۔

زمانے کے انقلابات اتنے ہمہ گیر ہوتے ہیں کہ مذہب واخلاق، تہذیب وتمدّن، اقتصادیات ومعاشرت غرض انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا کوئی پہلو اُس کے اثر سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ ایک قوم تباہ ہوتی ہے تو دوسری قوم اُس کی جگہ لے لیتی ہے۔ اپنی جدّت پسندیوں کے زور سے

وہ ایک جدید نظامِ حیات کی بنیاد ڈالتی ہے۔ اور اپنے خیالات کی ترجمانی کے لئے بھی نیا اسلوب بیان اور نئے الفاظ وضع کرتی ہے یا اپنے ساتھ لاتی ہے لیکن اس لفظِ خودی کی حالت بڑی قابلِ رحم ہے۔ ایران اور ہندوستان کی سرزمین کا جو حشر چنگیز خاں اور نادر شاہ کی تباہ کاریوں اور یلغاروں سے ہوا، تاریخ کے کسی طالب علم سے اُس کی حقیقت پوشیدہ نہیں۔ اُس کے علاوہ اِن ملکوں میں کئی حکومتوں نے ایک دوسرے سے زمامِ اختیار کو چھینا اور اپنی پیشرو حکومت کے کھنڈرات پر نئی حکومت تعمیر کی۔ لیکن یہ لفظِ خودی اِن انقلابات میں سے کسی سے بھی متاثر نہ ہوا بلکہ حسبِ سابق مردود و معتوب ہو کر زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہا۔

ساتویں صدی ہجری میں ایران اور روم کی سرزمین کو یہ شرف نصیب ہوا کہ مولینائے رومؒ نے اُس کی فضاؤں میں یہ نعرہ لگایا ؎

بمن نگر کہ بجز من بہر کہ در نگری   یقین بود کہ ز نورِ خدائے بے خبری

مسلسل تیس سال تک اِس مردِ خدا کے نعروں کی صدا گونجتی رہی لیکن اُس کے انتقال کے بعد پھر وہی سکون و جمود کی حالت چاروں طرف طاری ہوگئی اور خودی کے لفظ کو اپنی نشاۃِ ثانیہ سے پھر محروم ہونا پڑا۔

اِس واقعہ کو اب سات سو سال ہو چکے ہیں ہندوستان سے زیادہ کوئی ملک اس لفظ کا دشمن نہیں تھا۔ خدا کی غیرت آخر اس کو کہاں تک برداشت

کرتی کہ ایک ایسے لفظ کی یہاں پر اتنی تذلیل ہو جس کو لفظی اور معنوی اعتبار سے اُس کے ساتھ قُربِ حقیقی ہو۔ اِس لئے اُس نے خاکِ پنجاب سے ایک خودگر، خود شکن اور خودنگر ہستی کو پیدا کیا جس نے پہلے "خودی" کے صحیح مفہوم کو اس طرح واضح کیا ؎

"خودی" کیا ہے؟ تلوار کی دھار ہے!	یہ موجِ نفس کیا ہے؟ تلوار ہے!
خودی کیا ہے؟ بیداریٔ کائنات!	خودی کیا ہے؟ رازِ درونِ حیات!
من و تُو میں پیدا، من و تُو سے پاک!	اندھیرے اُجالے میں ہے تابناک!
نہ حد اُس کے پیچھے نہ حد سامنے!	ازل اس کے پیچھے، ابد سامنے!

سفر اس کا آغاز و انجام ہے
یہی اس کی تقویم کا راز ہے

اِس کے بعد خودی کی تمام مخالف طاقتوں کو دعوتِ مبارزت دی، ممولے کو شہباز سے لڑا دیا، سفینے کو موجوں سے ٹکرا دیا۔ مگر مچھ موجوں کی ہیبت سے سہمنے لگے اور انسان یزداں پر کمند ڈالنے لگا غرض اُس نے دُنیا میں ایک تخمِ خصومت بو دیا اور ہر کام و دہن کو لذّتِ پیکار کی چاٹ لگا دی ۔

یہ مثنوی اسرارِ خودی اُسی برگزیدہ ہستی کی تصنیف ہے۔ پروفیسر محمد یوسف خاں سلیم چشتی بی۔ اے (آنرز) کی یہ کوشش قابلِ قدر ہے کہ اُنھوں نے مثنوی کے مطالب کی شرح لکھ کر پڑھنے والوں کی رہنمائی کی۔ مثنوی مذکور ۱۹۱۵ء میں

شائع ہوئی تھی اس میں خودی کی حقیقت اور اُس کے مبادیات سے بحث کی گئی ہے جب تک پہلے ان امور سے اچھّی طرح واقفیت نہ ہو علاّمہ اقبال کے کلام کو سمجھنا دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی ہے ۔

اقبال اکیڈیمی لاہور کو قائم ہوئے ڈیڑھ سال کا عرصہ ہوا ہے یہ کتاب اُس کی مساعیِ جمیلہ کا چوتھا ثمرہ ہے ۔

۷ ر جولائی سنہ ۴۲ء

غلام سرور فگار
ایڈیٹر رسالہ پیغامِ حق



مقدمہ

(از جناب چھوٹے لال صاحب)

مثنوی "اسرارِ خودی" ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی۔ اُس کے شائع ہونے کے بعد ہی مشہور مستشرق ڈاکٹر نکلسن نے مصنف سے اُس کے ترجمے کی اجازت حاصل کی مگر ترجمہ فاضل مستشرق کی دوسری مصروفیتوں کی وجہ سے ۱۹۲۰ء سے قبل شائع نہ ہو سکا۔

مثنوی جس فلسفے کی حامل ہے اُس کا استخراج اور استنباط خود مثنوی سے اُس کی شاعرانہ حیثیت کی وجہ سے نسبتاً مشکل تھا اور خصوصاً مغربی دماغوں کے لئے اور بھی دشوار تھا۔ چنانچہ فاضل مترجم نے اقبال کی اس فلسفیانہ مثنوی کو یورپ میں روشناس کرانے کے لئے خود مصنف سے ہی اُس کی تشریح کی استدعا کی۔ انھوں نے پہلے نظریۂ خودی پر جو اُن کی مثنوی کی بنیاد ہے ایک مختصر مگر جامع مقدمہ وقتی طور پر لکھ دیا۔ ڈاکٹر نکلسن نے اُس

کو بجنسہ اپنے مختصر مقدمے میں شامل کر دیا ہے۔ ذیل میں اقبال کے اسی انگریزی مقدمہ کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے اُن کا اُردو مقدمہ جو اس مثنوی کی پہلی اشاعت میں شامل ہے اور یہ انگریزی مقدمہ دونوں مل کر مثنوی "اسرارِ خودی" کے فلسفیانہ پس منظر کو سمجھنے کے لئے غالباً مفید ہوں +

نکلسن کی رائے میں اقبال ایک مذہبی فلسفی یا متکلم ہیں۔ وہ جس طرح مشرقی خیالات کے ماہر ہیں۔ اُسی طرح مغربی علوم کے بھی متبحر نقاد ہیں۔ وہ اپنے فلسفیانہ خیالات میں نٹشے اور برگسان سے متأثر ہیں۔ اُنہوں نے اُن سے صحیح استفادہ کر کے اپنا مستقل نظام فلسفہ پیش کیا ہے۔ اُن کے احساسات ایک پُرجوش مسلم کے احساسات ہیں۔ اُن کا اسلام سے یہ عقیدت مندانہ تعلق دنیا میں ایسی حکومت چاہتا ہے جس میں مسلمانوں کے لئے قومیّت اور وطنیّت کی رکاوٹیں حائل نہ ہو سکیں۔ اُن کا نصب العین ایک ایسی آزاد مسلم برادری کا قیام ہے جس کا مرکز کعبہ ہو اور جو ایمان اور ایقان کے ساتھ اللہ اور اُس کے رسول پر مضبوط عقیدہ رکھتی ہو۔ اقبال نے اپنی مثنوی "اسرار و رموز" میں اسی کی تعلیم دی ہے۔ اُن کی دُوربین نظر نے یہ دیکھ لیا تھا کہ ہندو عقلیت اور مسلم تصوّف نے قوموں سے قوتِ عمل چھین کر اُن کو اپاہج بنا دیا۔ "حافظ" پر اُن کا انتقاد حقیقتاً اسی تباہ کن تصوّر کے خلاف آوازِ احتجاج بلند کرنا ہے۔ اسی نقطۂ نظر سے انہوں نے ایسے تصوّری فلسفے اور متصوفانہ شاعری سے

شدید اختلاف کیا ہے جس میں عمل کے لئے کوئی گنجائش نہ ہو۔

نکلسن کا اقبال مرحوم کے متعلق یہ خیال صحیح ہے کہ وہ مغربی خیالات سے متاثر ہیں (جہاں تک نٹشے سے متاثر ہونے کا تعلق ہے اقبال نے شدید انکار کیا ہے) اور اُن کے لئے متاثر ہونا ناگزیر بھی تھا لیکن "فلسفۂ عجم" کے مصنف کے ساتھ یہ بے انصافی ہوگی کہ اس کے خیالات کا ماخذ محض مغربی فلسفے کو قرار دیا جائے۔ اقبال کے نظام میں مغربی اور مشرقی دونوں قسم کے مفکّرین کے نقاط نظر کی نمائندگی ہے اور اُن سب کو آمیز کر کے انہوں نے ایک مستقل فلسفیانہ نظام کی تشکیل کی ہے۔

اب ہم ذیل میں اُس انگریزی مقدمہ کا جو اقبال نے ڈاکٹر نکلسن کی فرمائش پر اپنے نظریہ کی تشریح میں تحریر فرمایا تھا اردو ترجمہ کرتے ہیں۔

مثنوی اسرارِ خودی کی فلسفیانہ اساس

بریڈلے نے جو یہ کہا ہے کہ تجربہ کو محدود مرکز نہیں ہونا چاہئے اور محدود ہذیت کی شکل اختیار کرنا چاہئے بالآخر ناقابلِ تشریح ہے وُہ تجربات کے اِن ناقابل تشریح مرکزوں سے شروع کر کے ایک طرح کی وحدت پر پہنچ جاتا ہے جس کو وُہ "مطلق" کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ اس میں محدود مرکز اپنی محدودیت اور امتیاز کھو دیتا ہے۔ اُس کے قول کے مطابق محدود مرکز محض نمود ہیں۔ اُس کے نزدیک واقعیت کی معیاری خصوصیت شمولِ کل اور عموم ہے اور چونکہ ہر قسم کی محدودیت و اضافیت سے متاثر ہے لہذا مؤخرالذ

(یعنی محدودیت) محض دھوکا اور التباس ہے لیکن میرے خیال میں تجربہ کا یہ ناقابلِ تشریح محدود مرکز کائنات کی بنیادی حقیقت ہے۔ زندگی شخصی اور انفرادی حیثیت رکھتی ہے عمومی یا کلی حیات کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ خدا خود شخصیت اور انفرادیت ہے جو یکتا اور کامل ترین ہے۔ ڈاکٹر میکٹیگرٹ نے لکھا ہے کہ "کائنات شخصیتوں اور انفرادیتوں کے ائتلاف و اجتماع کا نام ہے" مگر اس پر اتنا اضافہ اور چاہیئے کہ اس اجتماع اور ائتلاف کی ترتیب اور اس میں توافق ازلی اور مکمل نہیں ہے، بلکہ یہ دانستہ اور باشعور کوششوں کا نتیجہ ہے، ہم درجہ بدرجہ بے نظمی سے تنظیم کی طرف بڑھ رہے ہیں اور اس کی تکمیل میں امداد دے رہے ہیں۔ اس ائتلاف اور اجتماع کے ارکان مقرر اور متعین نہیں ہیں۔ بلکہ اس اہم کام میں تعاون کے لئے نئے نئے رکن برابر آ رہے ہیں کائنات ایک مکمل عمل نہیں ہے بلکہ ہنوز تکمیل کے راستے میں ہے۔ کائنات کے متعلق کوئی مکمل صداقت ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ وہ خود ابھی تک کل یا مکمل نہیں بن چکی ہے، بلکہ تخلیقی عمل ہنوز جاری ہے۔ اس بے نظمی کے کسی نہ کسی حصّے میں نظم پیدا کرنے کا جہاں تک تعلق ہے انسان بھی اپنا حق ادا کر رہا ہے۔ قرآن میں خدا کے علاوہ دوسرے خالقوں کے امکان کا اشارہ موجود ہے۔ (وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن سُلَالَةٍ مِّن طِينٍ۔ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ۔ ثُمَّ خَلَقْنَا

النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ۔

ظاہر ہے کہ انسان اور کائنات کا یہ تصور انگریزی "نو ہیگلی" تصور اور ساتھ ساتھ وحدت وجود کے سامی تصوف کی ایک ایسی سب صورتوں کے خلاف ہے جو ایک عالمگیر حیات یا روح میں جذب ہو جانے کو انسان کا آخری نصب العین اور اس کی نجات قرار دیتے ہیں۔ انسان کا اخلاقی اور مذہبی نصب العین اپنی نفی نہیں ہے بلکہ اپنا اثبات ہے۔ وہ اس نصب العین کو زیادہ سے زیادہ منفرد اور زیادہ سے زیادہ یکتا اور کامل ہو کر ہی حاصل کر سکتا ہے۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ یعنی اپنے آپ میں صفاتِ الٰہی پیدا کرو۔ چنانچہ سب سے زیادہ یکتا شخصیت کے ساتھ زیادہ سے زیادہ مشابہ ہو کر انسان یکتا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا حیات کیا ہے؟ انفرادیت۔ اس کی اعلیٰ ترین صورت اس وقت تک "انا" یا خودی ہے، جس میں انفرادیت اپنے علاوہ دوسری چیزوں کو اپنے آپ سے خارج کر دیتی ہے، اور ایک محیط بالذات مرکز ہو جاتی ہے۔ جسمانی اور روحانی دونوں اعتبار سے انسان ایک محیط بالذات مرکز ہے، لیکن وہ ہنوز مکمل انفرادیت نہیں۔ اس کا خدا سے جتنا بعد ہوتا ہے اتنی ہی اس کی انفرادیت ضعیف

ہوتی ہے۔ خدا سے سب سے زیادہ قریب، سب سے زیادہ کامل ہے"
اِس کے یہ معنی نہیں کہ وُہ خدا میں جذب ہو جاتا ہے بلکہ برخلاف اس کے
وہ خدا کو اپنے آپ میں جذب کر لیتا ہے۔ صحیح اور حقیقی فرد مادی عالم کو ہی
اپنے آپ میں جذب نہیں کرتا ہے۔ بلکہ اس پر قابو پا کر خود خدا کو بھی اپنے
"انا" میں جذب کر لیتا ہے۔ حیات ایک جذب کرنے والی آگے کی طرف
حرکت ہے۔ یہ اپنی رفتار میں ہر قسم کی رکاوٹوں کو جذب کر کے دُور کر دیتی
ہے۔ نصب العینوں اور آرزوؤں کی متواتر تخلیق اُس کی خاصیّت ہے اِس
نے اپنی توسیع اور تحفظ کے لئے اپنے میں سے ہی حواس، عقل وغیرہ جیسے
آلات ایجاد کر لئے ہیں یا اُن کو نشوونما دیا ہے جو رکاوٹوں کو جذب کرنے
میں اُس کے معاون ہیں۔ راہِ حیات میں سب سے زیادہ مشکل رکاوٹ مادہ
اور فطرت ہے لیکن فطرت شر نہیں ہے کیونکہ یہ حیات کی مخفی طاقتوں کے
کھلنے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے۔

"انا" کو اپنے راستے کی تمام رکاوٹوں کو دُور کرنے سے آزادی حاصل
ہوتی ہے۔ وہ ایک حد تک آزاد ہے اور ایک حد تک مقدر یا طے شدہ۔
مکمل آزادی یا آزاد ترین انفرادیت خدا کی طرف متوجہ ہونے سے حاصل ہوتی ہے۔
مختصر لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ حیات نام ہے آزادی کے لئے جدوجہد کا۔

انا اور شخصیّت کا تسلسل مرکزِ حیات انسان میں "انا" یا شخصیّت

کی شکل اختیار کر لیتا ہے شخصیت ایک تکاثفی اور تجاذبی حالت ہے جو اس تکاثف کو قائم رکھنے سے ہی قائم رہ سکتی ہے۔ اگر تکاثفی اور تجاذبی حالت قائم نہ رہے تو اضمحلال واقع ہو جائے گا شخصیت یا تکاثفی و تجاذبی حالت کا قیام انسان کا قیمتی کارنامہ ہے۔ اِس کا خیال رکھنا چاہیئے کہ وہ اضمحلال کی حالت کی طرف نہ لوٹ جائے۔ جو شے اس تکاثفی و تجاذبی حالت کو قائم رکھنے کا باعث ہو، وہی ہمیں غیر فانی بنا دینے کی باعث ہے شخصیّت کا تصوّر ہمارے سامنے قدروں کا معیار پیش کر دیتا ہے، اور خیر و شر کے مسئلہ کو طے کر دیتا ہے۔ جو شے شخصیّت کو استحکام بخشے اچھی ہے۔ اور جو اس کو کمزور کرے بری ہے۔ فنون، مذاہب اور اخلاقیات کا فیصلہ شخصیّت کے نقطۂ نظر سے ہی کرنا چاہیئے۔ افلاطون پر میرے انتقاد کا رُخ حقیقتاً اُن تمام نظامہائے فلسفہ کے خلاف ہے، جو زندگی کے مقابلے میں فنا کو نصب العین قرار دیتے ہیں۔ وُہ نظام جو زندگی کی سب سے بڑی رکاوٹ یعنی مادے کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور اُس کو جذب کرنے کے بجائے اُس سے بھاگنے کی تعلیم دیتے ہیں۔

جس طرح "انا" کی آزادی کے سلسلے میں مادے کے مسئلہ سے دو چار ہونا پڑتا ہے، اُسی طرح اُس کے غیر فانی ہونے کے سلسلے میں مسئلہ زمان سامنے آجاتا ہے۔ برگسان ہمیں بتاتا ہے کہ زمان ایک لامتناہی خط (اپنے مکانی مفہوم میں) نہیں ہے جس سے خواہ مخواہ ہمیں گزرنا ہی ہے، زمانے

کا یہ تصور صحیح نہیں۔ حقیقی زمانے میں کوئی طول نہیں ہے۔ شخصی بقا ایک تمنا ہے
اور اگر تم اُس کے حصول کی کوشش کرو تو حاصل کر سکتے ہو۔ یہ حصول اس زندگی
میں تفکر و عمل کے اُن طریقوں کے اختیار کرنے پر موقوف ہے جو تکاثفی و تجاذبی
حالت کو قائم رکھنے کے باعث ہوں۔ بدھ مت، ایرانی تصوف اور اسی طرح
کے دوسرے نظامہائے اخلاق گو ہمارے مقصد کے مطابق نہیں، لیکن وہ
بالکل بیکار بھی نہیں ہیں، کیونکہ شدید جد و جہد کے بعد کچھ وقت کے لئے ہمیں
مُسکّن اور خواب آور چیزوں کی ضرورت ہے۔ حیات کے روشن دنوں میں
تفکر و عمل کی یہ صورتیں راتوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ چنانچہ اگر ہمارے عمل کی توجہ
تکاثفی و تجاذبی حالت کے قائم رکھنے کی طرف ہے تو موت کا صدمہ اُس پر
اثر انداز نہ ہوگا۔ موت کے بعد اضمحلال کا ایک وقفہ ہو سکتا ہے، جیسا کہ قرآن
نے برزخ یا ایک درمیانی حالت کے متعلق بیان کیا ہے جو یوم حشر تک قائم رہتا
ہے۔ اس حالت میں وہی "انا" باقی رہیں گے جنہوں نے اس زندگی میں کافی
نگہداشت کی ہے گو حیات اپنے ارتقا میں اعادے اور تکرار سے متنفر ہے پھر
بھی بقول "ولڈن کار" برگسان کے اصول کے مطابق جسمانی حشر ممکن ہے زمانے
کو لمحات میں تقسیم کر کے اُس کو مکانی بنا دیتے ہیں اور پھر اُس پر غالب آنے میں
دشواریاں محسوس کرتے ہیں۔ زمانے کا صحیح اندازہ، اپنے باطن کی گہرائی میں نظر ڈالنے
سے ہوتا ہے۔ حقیقی زمانہ خود حیات ہی ہے جو اپنے آپ کو اُس وقت تک کی

حاصل شدہ تکاثفی و تجاذبی حالت (شخصیّت) کو قائم رکھ کر ہی محفوظ رکھ سکتی ہے۔ ہم زمانے کے اُس وقت تک ماتحت ہیں جب تک کہ ہم اُس کو مکانی سمجھیں۔ مکانی زمانہ ایک قسم کی بیڑی ہے جس کو حیات نے اپنے لئے گھڑ لیا ہے تاکہ موجودہ ماحول کے مطابق بن سکے۔ حقیقتاً ہم غیر زمانی ہیں اور یہ ممکن ہے کہ اسی زندگی میں ہم اپنے غیر زمانی ہونے کو محسوس کرلیں گے گو یہ کشف اور احساس ایک آنی ہی ہو۔

انا کی تعلیم

انا کا استحکام عشق سے ہوتا ہے یہ لفظ (اس موقع پر) بہت وسیع معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس کے معنی ہیں جذب کر لینے اور اپنے آپ میں سمو لینے کی خواہش۔ اس کی سب سے اعلیٰ صورت قدروں اور نصب العینوں کی تخلیق اور اُن کو ایک واقعیت بنا لینے کی کوشش ہے عشق، عاشق اور معشوق دونوں کو منفرد بنا دیتا ہے۔ سب سے زیادہ یکتا شخصیت کی واقعیت کو اپنا لینے کی کوشش طالب کو منفرد بنا دیتی ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ مطلوب کی انفرادیت کو متضمن ہوتی ہے۔ کیونکہ کوئی دوسری شے طالب کی فطرت کو مطمئن نہیں کرسکتی جس طرح عشق "انا" کو مستحکم کرتا ہے اسی طرح سوال اس کو کمزور کرتا ہے۔ جو شے بھی شخصی جدو جہد سے حاصل نہ ہو، سوال کے ہی تحت ہے۔ ایک مالدار شخص کا بیٹا جس کو باپ کی دولت وراثت میں ملی ہے ایک بھکاری ہے یہی حال اُس شخص کا ہے جو دوسروں

کے خیال کو سامنے رکھ کر سوچتا ہے۔ لہذا" انا" کے استحکام کے لئے ہمیں عشق یعنی جذب کر لینے والے عمل کی طاقت کو نشوونما دینا چاہیئے اور ہر قسم کے سوال یعنی بے عملی سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسّلام کی سیرت میں جذب کر لینے والے عمل کا سبق موجود ہے اور خصوصاً ایک مسلمان کے لئے۔

مثنوی کے دوسرے حصّے میں مَیں نے اسلامی اخلاقیات کے عام اصولوں کی طرف اشارہ کیا ہے اور شخصیت کے تصوّر کے سلسلے میں اُس کے معنی کے انکشاف کی کوشش کی ہے۔ یکتائی کی جانب حرکت کرنے میں "انا" کو تین منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔

(ا) قانون کی پابندی۔

(ب) ضبطِ نفس جو خود آگاہی یا انانیت کی سب سے اعلیٰ صورت ہے۔

(ج) نیابتِ الٰہی۔

نیابتِ الٰہی اس زمین پر انسانی نشوونما کا تیسرا اور آخری درجہ ہے نائب کی حیثیت کرۂ زمین پر خلیفۃ اللہ کی ہے۔ وہ کامل ترین "انا" ہے۔ انسانیت کا مقصد اور ذہنی اور جسمانی دونوں قسم کی حیات کا منتہیٰ ہے۔ اُس میں ہماری ذہنی زندگی کی بے آہنگی ہم آہنگی بن جاتی ہے۔ اُس میں اعلیٰ ترین طاقت اعلیٰ ترین علم کے ساتھ متحد ہو جاتی ہے۔ اُس کی زندگی میں خیال و عمل، استدلالی اور فکری علم سب ایک ہو جاتے ہیں۔ نخلِ انسانیت کا وہ آخری ثمر ہے اس لئے

پُر اذیت ارتقاء کے تمام ابتلا حق بجانب ہیں کہ نتیجے میں وہ پیدا ہوتا ہے۔ نوعِ انسان کا وہ حقیقی حاکم ہے۔ اُس کی حکومت خدا کی حکومت ہے وہ اپنی متاعِ فطرت میں سے دوسروں پر حیات کی دولت لٹاتا ہے اور ان کو تدریجاً اپنے آپ سے قریب لاتا رہتا ہے۔ ارتقاء میں ہم جتنا آگے بڑھتے ہیں اتنا ہی اُس سے نزدیک ہو جاتے ہیں۔ اُس تک پہنچنے میں ہم معیارِ حیات کے اعتبار سے اپنے آپ کو بلند کرتے ہیں جسم و ذہن دونوں کے اعتبار سے انسانیت کا نشوونما اُس کی پیدائش کے لئے ایک مقدم شرط ہے۔ اگرچہ فی الحال اس کی حیثیت ایک نصب العین کی سی ہے مگر انسانیت کے ارتقاء کا رُخ، کم و بیش یکتا افراد کی جمہوریت پیدا کرنے کی طرف ہے، جو اُس کے لئے مناسب اور موزون "آبا" ہوں گے۔ زمین پر خدا کی حکومت کے معنی دنیا کی ممکن بلند ترین شخصیت کے تحت کم و بیش یکتا افراد کی جمہوریت ہے۔ نٹشے کو اِس معیاری اور نصب العینی نسل کی ایک جھلک محسوس ہو گئی تھی لیکن اُس کے الحاد اور اعلیٰ طبقے کے لئے اُس کی عصبیت نے اُس کے پُورے تصوّر کو بگاڑ کر رکھ دیا۔

دیباچہ

ترجمانِ حقیقت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ اپنے نظریۂ خودی کی تشریح میں جو کچھ خود تحریر فرما چکے ہیں وُہ آپ نے پڑھ لیا۔ آپ کا کلام مطالعہ کرنے سے پہلے لازمی اور ضروری ہے کہ جو مباحث مقدمہ میں آئے ہیں اُن کو خوب ذہن نشین کر لیا جائے کیونکہ آپ نے اپنے فلسفہ کے بنیادی اصول تمام تر "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بیخودی" میں بیان فرمائے ہیں اور تصانیف مابعد میں زیادہ تر انہی اصولوں کی تشریح و توضیح کی گئی ہے۔ افسوس کہ اکثر مسلمان ان دونوں مثنویوں کے مرکزی خیالات اور اصولی مطالب سے بھی ناآشنا ہیں اسلئے مَیں مناسب سمجھتا ہوں کہ پہلے ان کتابوں کے مباحث کا خلاصہ آسان اور عام فہم انداز میں پیش کیا جائے اس کے بعد اُن مباحث کے متعلق جو کچھ علامہ نے تصانیف مابعد میں وضاحت فرمائی ہے اُسے مخصوص عنوانات کے ماتحت پیش کیا جائے۔ مقصود اس کاوش سے صرف اس قدر ہے کہ مسلمان علامہ کے زندگی بخش پیغام سے آشنا ہو سکیں۔

محمد یوسف خان سلیم چشتی

۱۵ فروری ۱۹۳۹ء

مبحث اوّل

خلاصۂ مطالبِ مثنوی اسرارِ خودی

علامہ کا مقصد اِس مثنوی کے لکھنے سے اپنی لیاقت شعری کا اظہار نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کو ایک پیغام دینا ہے

شاعری زیں مثنوی مقصود نیست — بُت پرستی بُت گری مقصود نیست

اِس تصریح کے بعد علامہ موصوف نفس مضمون کی طرف آتے ہیں۔

خودی کیا چیز ہے؟ خودی اصلِ نظامِ عالم ہے اور تسلسلِ حیات استحکامِ خودی پر منحصر ہے۔ کائنات کی ہر شے میں "خودی" کا ظہور پایا جاتا ہے۔

پیکرِ ہستی ز آثارِ خودی است — ہرچہ می بینی ز اسرارِ خودی است

خویشتن را چوں خودی بیدار کرد — آشکارا عالمِ پندار کرد

صد جہاں پوشیدہ اندر ذاتِ او — غیرِ او پیداست از اثباتِ او

ترجمہ:-

ہر موجود میں خودی پائی جاتی ہے اور دُنیا میں جو کچھ نظر آتا ہے یہ سب "خودی" کا ظہور ہے۔ اس دنیا کا ظہور خودی کی بیداری کی بدولت ہُوا ہے۔ خودی میں ایک دنیا پوشیدہ ہے اور جب اس کا اثبات کیا جاتا ہے تو اس کے ساتھ اس کے غیر کا وجود بھی ثابت ہو جاتا ہے۔

مطلب یہ کہ دنیا میں جس قدر اشیا موجود ہیں سب میں خودی پائی جاتی ہے۔ نیز حیوانات کے علاوہ نباتات اور جمادات میں بھی خودی کے آثار موجود ہیں۔ گویا کوئی شے ایسی نہیں جس میں خودی نہیں۔ پس "خودی" کیا ہے؟ اصل نظامِ عالم ہے۔ خودی نہ ہو تو نظامِ کائنات درہم برہم ہو جائے۔

خودی کے خواص۔

بہرِ یک گُل خونِ صد گلشن کند ۔۔۔ از پئے یک نغمہ صد شیون کند
یک فلک را صد ہلال آوردہ است ۔۔۔ بہرِ حرفے صد مقال آوردہ است
عذرِ ایں اسراف و ایں سنگیں دلی ۔۔۔ خلق و تکمیلِ جمالِ معنوی

کائنات کی تخلیق اس نہج پر کی گئی ہے کہ جہان میں ہر جگہ خصومت اور خونریزی (جسے قرآن نے فسکِ دم سے تعبیر کیا ہے) نظر آتی ہے اور اس کا مطلب یہ یہ ہے کہ فطرت بظاہر ہر وقت غارت گری اور تباہ کاری پر کمربستہ رہے اگر اسی خونریزی سے جمالِ معنوی ظاہر ہوتا ہے پس یہ خونریزی بلاوجہ نہیں ہے

اور بے فائدہ بھی نہیں۔

خالق خودی نے خودی کی فطرت ہی ایسی بنائی ہے کہ وہ جنگ و جدل میں مصروف رہتی ہے۔ مقابلہ اور خصومت پر کمر بستہ نظر آتی ہے۔ کس لئے؟ تاکہ جمالِ معنوی کی تکمیل ہو سکے۔

کیا آپ تھوڑا سا مشک حاصل کرنے کے لئے بہت سے ہرنوں کا پیٹ بلا تامّل چاک نہیں کر دیتے؟ ایک گلدستہ بنانے کے لئے بہت سے پودوں کو بے رونق نہیں کرتے؟ ایک چھوٹی سی آرزو کی تکمیل کے لئے انسان کیا کچھ نہیں کر گزرتا؟ کیا ہیلن اور سیتا کو حاصل کرنے کی غرض سے لاکھوں انسانوں کی قربانی نہیں دی گئی؟ کیا ایک آفتاب کو طلوع کرنے کی غرض سے فطرت لاکھوں ستاروں کا خون نہیں کرتی؟ ایک ڈگری حاصل کرنے کے لئے ایک طالب علم سینکڑوں راتوں کی نیند قربان نہیں کرتا؟ ایک موتی کی خاطر کیا بعض اوقات سینکڑوں جانیں ضائع نہیں جاتیں؟

الغرض فطرت اگرچہ بظاہر خونریزی کرتی ہے لیکن یہ سب روا ہے کیونکہ جمالِ معنوی اسی صورت سے پیدا ہوتا ہے۔ خودی کی طاقتیں اس قدر عظیم الشان ہیں کہ عقل میں نہیں سما سکتیں۔

وسعتِ ایّام جولاں گاہِ او آسماں، موجے ز گردِ راہِ او

زمانہ کی وسعت اس کی جولانگاہ ہے اور آسمان اس کی گردِ راہ سے

زیادہ قدر و قیمت نہیں رکھتا۔

شعلۂ خود در شرر تقسیم کرد   جز پرستی عقل را تعلیم کرد

"خودی نے اپنے شعلہ کو شراروں میں تقسیم کردیا ہے اور عقل کو جز پرستی سی نے سکھائی ہے۔

واضح ہو کہ عقل انسانی اپنی ترکیب کے لحاظ سے کل کو نہیں دیکھ سکتی وہ صرف جزئیات کا ادراک کرسکتی ہے۔ کل کو دیکھنے کی طاقت کشف (INTUITION) میں ہے جو عقل (INTELLECT) سے بالاتر قوت ہے۔ یہ قوت اُن حقائق کا ادراک کرتی ہے جو عقل کی دسترس سے باہر ہیں۔

وانمودن خویش را خوئے خودی است   خفتہ در ہر ذرّہ نیروئے خودی است

خودی کی اصلی اور حقیقی صفت یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو ظاہر کرنا چاہتی ہے اور کائنات کے ذرّہ ذرّہ میں خودی کی طاقت پوشیدہ ہے۔

یہ ایک حقیقتِ ثابتہ ہے کہ ہر انسان اپنے مرتبہ اور درجہ کے مطابق اپنے دائرہ عمل میں اپنی خودی کا اثبات و اظہار کرنا چاہتا ہے اور یہ خواہش اس قدر ہمہ گیر اور زبردست ہے کہ انسان پر ہر وقت حکمرانی کرتی ہے۔ یہ خودی کی جبلی خاصیت ہی تو ہے جو ہر پہلوان کو خم ٹھونک کر اکھاڑہ میں اُترنے پر مائل کرتی ہے، ہر شاعر کو مجمع عام میں اپنا کلام سنانے کے لئے کھینچ بلاتی ہے

مصوّر اسی جذبہ کے ماتحت اپنی تصاویر کی نمائش کرتا ہے مغنّی اسی شراب کے نشہ سے سرشار ہو کر محفل میں اپنا ساز چھیڑتا ہے اور سامعین کو محوِ حیرت بنا دیتا ہے۔

زندگی کا معیار:۔

خودی کی صفت بیان کرنے کے بعد علّامہ نے زندگی کا معیار دنیا کے سامنے پیش کیا ہے:۔

چوں حیاتِ عالم از زورِ خودی است — پس بقدرِ استواری زندگی است

چونکہ دنیا کی زندگی، خودی کی طاقت پر ہی منحصر ہے اس لئے زندگی (حیات) کے ادنیٰ یا اعلےٰ کمتر یا بیشتر، بہتر یا بدتر، خوب یا زشت اور بیش قیمت یا کم قیمت ہونے کا معیار صرف اُس کی استواری ہے۔ خودی میں جس قدر استواری، پائداری، پختگی، مضبوطی اور سختی ہوگی۔ اسی قدر وہ قیمتی، اعلیٰ، خوب اور بیش قیمت ہوگی، اور جس قدر کمزور، ضعیف، ناتواں اور نرم ہوگی اسی قدر ناکارہ، بیکار، زشت، ادنیٰ اور معمولی ہوگی۔

علّامہ نے کارگاہِ فطرت سے اپنے دعویٰ پر جو شہادت پیش کی ہے وہ ملاحظہ کے قابل ہے۔

قطرہ چوں حرفِ خودی از بر کند — ہستیٔ بے مایہ را گوہر کند

دیکھ لیجیے جب پانی کی بوند، جو ایک بے حقیقت چیز ہے صدف کے

اندر خودی کا رنگ اختیار کر لیتی ہے تو اس استواری کی بدولت موتی بن جاتی ہے۔

بادہ از ضعفِ خودی بے پیکر است　　پیکرش منت پذیرِ ساغر است

شراب رقیق شے ہے اور اس کی خودی ضعیف ہے، اس لئے اس کی اپنی ہستی کی کوئی معین شکل نہیں ہے اور اپنی شکل کے لئے وہ ساغر کی محتاج ہے

چوں زمیں بر ہستیٔ خود محکم است　　ماہ پابندِ طوافِ پیہم است

زمین کی ہستی (خودی) استوار ہے۔ اس لئے چاند اس کے گرد طواف کرتا ہے۔

ہستیٔ مہر از زمیں محکم تر است　　پس زمیں مسحورِ چشمِ خاور است

لیکن سورج کی ہستی زمین سے زیادہ استوار ہے۔ اس لئے زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔

حیات و بقائے خودی :-

پانی کی زندگی بہنے پر، آگ کی زندگی جلنے پر، ہوا کی زندگی چلنے پر اور آفتاب کی زندگی چمکنے پر منحصر ہے۔ اسی طرح خودی کی زندگی اور بقا تلاشِ پیہم اور سعیٔ مسلسل پر موقوف ہے۔ علامہ فرماتے ہیں :-

زندگانی را بقا از مدعا است　　کاروانش را درا از مدعا است

زندگی در جستجو پوشیدہ است　　اصلِ او در آرزو پوشیدہ است

از تمنّا رقص دل در سینہ ہا | سینہ ہا از تاب او آئینہ ہا
دل ز سوزِ آرزو گیرد حیات | غیر حق میرد چو او گیرد حیات

مدعا، جستجو، آرزو، تمنا چاروں کا مفہوم ایک ہی ہے یعنی اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری خودی (شخصیت) زندہ رہے تو کوئی مقصد (IDEAL) اپنے سامنے رکھو کسی نصب العین کے حصول کے لئے کوشاں رہو اور جب ایک مقصد حاصل ہو جائے تو فوراً دوسرا مقصد پیدا کرو۔ اگر تمہارے اندر تخلیق مقاصد کی قوت نہیں تو دعوئے اسلام غلط ہے۔

ہر کہ او را قوّتِ تخلیق نیست | نزدِ ما جز کافر و زندیق نیست

جس انسان نے اپنی زندگی کا کوئی خاص مقصد معیّن نہیں کیا۔ یعنی جس کے دل میں کسی نصب العین کے حصول کی آرزو نہیں، اس میں اور حیوانات میں مطلق فرق نہیں۔ جس انسان کے دل میں کوئی آرزو نہ ہو وُہ زندہ نہیں بلکہ مُردہ ہے۔

آرزو را در دلِ خود زندہ دار | تا نگردد مشتِ خاکِ تو مزار

وجہ کیا ہے؟ وُہ بھی سنئے:-

زندہ را نفیٔ تمنّا مُردہ کرد | شعلہ را نقصانِ سوز افسردہ کرد

شعلہ کی ہستی سوزش اور تب و تاب پر منحصر ہے۔ اگر سوزش جاتی رہے تو وہ افسردہ ہو جائے گا اور پھر اس پر شعلہ کا اطلاق عائد نہیں ہو سکتا اسی طرح

"خودی" کی حیات آرزو یا تمنا پر موقوف ہے۔ اگر کسی انسان کے دل میں کوئی تمنا یا آرزو نہ ہو اگر کوئی نصب العین اس کے سامنے نہ ہو تو وہ بھی مُردہ ہو جائیگا اور انسان کا اطلاق اس پر نہیں ہو سکتا۔

غایت الکلام:۔

الغرض علامہ کا نظریہ یہ ہے کہ

(۱) خودی کی حیات تخلیقِ مقاصد پر منحصر ہے۔

(۲) جو انسان بغیر کسی نصب العین (IDEAL) کے زندگی بسر کرتا ہے وُہ زندہ نہیں بلکہ مُردہ ہے۔

(۳) جس قوم کے سامنے کوئی نصب العین (IDEAL) نہ ہو وُہ قوم بھی مُردہ ہے اگرچہ اس کے افراد کی تعداد مردم شماری میں نو کروڑ ہی کیوں نہ ہو۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا ہندی مسلمانوں کے سامنے کوئی نصب العین (IDEAL) ہے؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے اور حقیقتًا نفی میں ہے تو پھر علامہ نے اُن سے بجا طور پر یوں خطاب کیا ہے،

تا کجا بے غیرتِ دیں زیستن　　　اے مسلماں مُردن است ایں زیستن

پھر دوسری جگہ یوں کہتے ہیں،

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے　　　مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

غایتِ علم و فن۔

علوم و فنون کا حقیقی مقصد صرف یہ نہیں ہے کہ انسان کو چند حقائق علمیہ حاصل ہو جائیں یا بعض فنون میں مہارت حاصل ہو جائے بلکہ علم کا مقصد یہ ہے کہ اس کی بدولت انسان اپنی خودی کی حفاظت و صیانت کا سامان مہیا کر سکے اور اپنی خودی کی استواری کو برقرار رکھ سکے۔

آگہی از علم و فن مقصود نیست　　غنچہ و گل از چمن مقصود نیست
علم از سامانِ حفظِ زندگی است　　علم از اسبابِ تقویمِ خودی است

ایک غلطی کا ازالہ۔

بعض لوگ کہا کرتے ہیں،

ART FOR THE SAKE OF ART AND
KNOWLEDGE FOR THE SAKE OF KNOWLEDGE

یعنی فن کو محض فن کی غرض سے یا علم کو محض علم کی غرض سے حاصل کرنا چاہیئے بالفاظ دیگر علم و فن بذاتِ خویش مقصود ہیں۔ لیکن علاّمہ موصوف اس نظریہ کو غلط قرار دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ علم و فن مقصود بالذّات (END IN ITSELF) نہیں بلکہ مقصود بالعرض ہیں۔

علم و فن کو محض علم و فن کے لئے حاصل کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ یہ ان لوگوں کا نظریہ ہے جو ثروت و امارت کے فریب میں مبتلا ہو کر اپنی خودی کی

حفاظت سے غافل ہو گئے ہیں۔ زندہ اقوام علم و فن کو اس لئے حاصل کرتی ہیں کہ وہ ان سے خودی کی خدمت کر سکیں۔

علّامہ فرماتے ہیں کہ آرٹ، علم اور مذہب تینوں کو خودی کا خادم ہونا چاہیے جو شخص دن رات مذہبی زندگی بسر کرتا ہے، ہر وقت باوضو رہتا ہے، راتوں کو اٹھ کر تہجد پڑھتا ہے، ہفتوں مسلسل روزے رکھتا ہے، صبح شام تلاوت کرتا ہے، سبحہ شماری سے کسی وقت غافل نہیں ہوتا، لیکن اس کی "خودی" ضعیف ہے یا اس کا دل خوابیدہ ہے تو یہ سجدے یہ قیام یہ تلاوت یہ تسبیح سب بے سود ہے

کافرِ بیدار دل پیشِ صنم به ز دینداری که خفت اندر حرم

کیوں؟ اس لئے سجدہ اور قیام، تلاوت اور تسبیح وغیرہ مقصود بالذات نہیں ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ چاروں چیزیں تو آج بھی ہندوستان کے ہر شہر، ہر قصبہ ہر گاؤں میں موجود ہیں، پھر مسلمان غلام کیوں ہے؟

اَللّٰہُ اَکبر! مسلمان اور غلام! یہ تو اجتماع نقیضین ہے۔ قرآن مجید کی نص صریح کے خلاف ہے:-

اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ

معلوم ہوا کہ جو سجدہ اور قیام، غلامی کی زنجیروں کو کاٹنے کے لئے سوہان کا کام نہ دے وہ سجدہ اور قیام ہی نہیں محض ایک رسم ہے، ایک نمود ہے، ایک خود فریبی ہے ع

تیرا دِل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں؟

اِسی طرح علم و فن بھی (MEAN TO AN END) سے (END IN ITSELF) نہیں ہے۔ اور وُہ مقصود کیا ہے؟ یہی کہ اگر علم و فن سے خودی میں استواری، دماغ میں روشنی، اور دِل میں اُمنگ پیدا ہو تو وہ علم و فن محمود ہے اور اگر یہ باتیں پیدا نہ ہوں تو مذموم ہے۔

اُس صنیبیتی[1]، ایسا غوجی، مطوّل، مختصر، حمد اللہ، قاضی مبارک، ہدایۂ سعیدیہ اور شمس بازغہ سے کیا فائدہ جو خودی کو قعرِ مذلیت سے باہر نکالنے میں معاونت نہ کر سکے؟ اس طواف، اعتکاف، تہلیل، تحمید، چلّہ کشی، جاروب کشی، مراقبہ اور مجاہدہ سے کیا حاصل جو "خودی" کی حفاظت کرنے سے قاصر ہو۔

آج ہندوستان کے مسلمان نوجوان جنہیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرنا چاہئے تھا، تقلیدِ مغرب کے نشہ میں چور ہیں اور دن رات (ART[2] FOR THE SAKE OF ART) کا وظیفہ پڑھتے رہتے ہیں جب کوئی دردمند مسلمان، ان وارفتہ نوجوانوں سے دریافت کرتا ہے کہ تم اپنا وقت شاعری، مصوّری اور موسیقی میں کیوں ضائع کر رہے ہو؟ تو یہ مغرب زدہ نوجوان اس مسلمان کو دقیانوسیت اور تنگ نظری کا طعنہ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم

---

[1] یہ یونانی طرز پر اسلامی فلسفہ اور منطق کی وہ کتابیں ہیں جو ہمارے دینی مدرسوں مثلاً دارالعلوم دیوبند وغیرہ میں پڑھائی جاتی ہیں۔ [2] علم و فن برائے علم و فن۔

فنونِ لطیفہ حاصل نہ کریں تو مہذّب کس طرح بنیں گے ؟

اَب اِن سادہ لوحوں کو کون بتائے کہ جب وُہ شے ، جسے تم مہذّب بنانا چاہتے ہو ، مُردہ ہو چکی ہے تو وُہ مہذّب کس طرح بنے گی ۔ پہلے اُسے زندہ تو کرو ۔

دلِ مُردہ ، دل نہیں ہے اسے زندہ کرد وبارہ کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

یورپ کی تقلید کو رہیں مسلمان نوجوانوں نے مصوّری تو شروع کر دی لیکن اپنی خودی کو بچانے کے لئے توپوں سے ٹکرانے کا فن مطلق حاصل نہیں کیا ، جو حیات کی شرطِ اوّلیں ہے ۔ مانا کہ یورپ نے فنونِ لطیفہ کو تہذیب کا معیار قرار دیا ہے اور جو مسلمان نوجوان بال میں رقص کرنا اور کلب میں برج کھیلنا نہیں جانتا وہ مہذّب نہیں کہلا سکتا ۔ لیکن اقوام یورپ نے بال (BALL) کلب (CLUB) اور باتھ (BATH) کے ساتھ ساتھ ایروپلین (AIRO PLANE) ٹینک (TANK) تارپیڈو TAR PEDOE کی قربان گاہ پر جان نذر کرنے کا فن بھی تو سیکھا ہے ۔

انھوں نے اپنی خودی کو بھی تو اس قدر مضبوط بنا لیا ہے کہ آج ساری خدائی اس کی زد میں آ چکی ہے ، کیا ہمارے مسلمان نوجوانوں کی خودی بھی ایسی ہی مضبوط ہے ؟

حقیقت یہ ہے کہ جس علم سے کوئی نفع نہ ہو ، جس فن سے کوئی فائدہ نہ

ہو وہ علم اور وہ فن دونوں بیکار ہیں۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم فرماتے ہیں۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَعُوْذُبِکَ مِنَ الْعِلْمِ لَا یَنْفَعُ۔ — اے خدایا میں ایسے علم سے تیری پناہ مانگتا ہوں جو نفع نہ دے۔

علامہ موصوف نے اسی حقیقت کو مذکورہ بالا اشعار میں واضح کیا ہے کہ "علم محض علم کے لئے" یہ نظریہ غلط ہے، علم ہو یا فن، مذہب ہو یا تصوف جو کچھ بھی ہو اسی حد تک لائقِ حصول و قابلِ ستائش ہے جس حد تک وہ میری خودی کی حفاظت اور ترقی اور استواری میں معاونت کر سکتا ہے۔

یورپ نے علوم و فنون کو "اپنی خودی" کے جوہر کو چمکانے کے لئے بطور صیقل استعمال کیا۔ اسی علم و فن کی بدولت انہوں نے عناصر اربعہ کو اپنا محکوم بنایا، اسی کے بل بوتے پر وہ آج کائنات پر حکمرانی کر رہا ہے۔

قوتِ افرنگ از علم و فن است ۔۔۔ از ہمیں آتش چراغش روشن است

مسلمان نوجوانوں نے صرف تصویر کا ایک ہی رُخ دیکھا، وُہ رُخ جو ان کی موجودہ پست ہمتی کی بنا پر، ان کو بالطبع مرغوب ہے۔ تن آسانی، عیش کوشی اور کنجِ عافیت بلاشبہ مصوّری اور موسیقی بہت اچھی چیزیں ہیں، مگر کب اور کس لئے؟ یہ بھی تو غور طلب ہے۔

اس وقت جب تسخیرِ کائنات کے شغلِ جاں گسل سے طبیعت فطری طور

پر، آرام کی طالب ہو، اور اس کے لئے جو اپنی خودی کو فولاد کی طرح مضبوط کر چکا ہو اور اسے اپنی خواہشات پر اس قدر اقتدار حاصل ہو کہ اگر وہ غسل خانے کے ٹب کے اندر بھی بگل کی آواز سُنے تو بے اختیار اسی حالت میں (ATTENTION)[1] کی مجسم تصویر بن جائے۔

قصہ مختصر پہلے یہ دیکھو کہ خودی محفوظ ہے یا نہیں۔ بلکہ صاف تر لفظوں میں یہ سمجھو کہ خودی زندہ ہے یا نہیں۔ اگر وہ زندہ ہے تو بے شک اُسے مہذب بناؤ۔ لیکن اگر وہ مُردہ ہو تو پہلے اُسے زندہ کرو۔ پھر اس کی تہذیب کا انتظام کرو۔

اِس بات کے معلوم کرنے کا ذریعہ کہ خودی زندہ ہے یا مُردہ؟ یہ ہے کہ یہ دیکھو کہ تم نے اپنی زندگی کا کوئی مقصد معیّن کیا ہے؟ کیا تم کسی نصب العین (IDEAL) کے لئے جی رہے ہو؟ کیا کسی "محبوب" کے حاصل کرنے کی تڑپ دِل میں موجود ہے؟

---

[1] ایک فوجی اصطلاح ہے جس کے معنی ہیں کہ افسر کے حکم کی تعمیل کے لئے ہمہ تن گوش ہو جاؤ۔ انگریز قوم کے افراد میں فرض ادا کرنے کا احساس اس درجہ قوی ہے کہ پروفیسر فوز مناڈ نے اپنی سایکالوجی میں ایک مثال بیان کی ہے کہ بعض فوجی سپاہی جب بگل کی آواز سُنتے ہیں تو فی الحقیقت نہاتے نہاتے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ ان کے دل و دماغ پر یہ احساس مستولی ہو جاتا ہے کہ میں صرف تعمیلِ حکم کے لئے زندگی بسر کرتا ہوں۔ اور یہ احساس ہی تو راقم السطور کی رائے میں اُن کی کامیابی کا سنگِ بنیاد ہے۔

اگر ہے تو دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا تم روز بروز اپنے نصب العین (IDEAL) سے نزدیک ہوتے جاتے ہو اور نزدیکی کا ثبوت یہ ہے کہ تمہارے اندر تبدیلی، تغیّر اور انقلاب پیدا ہوگا۔ تمہاری زندگی ہر روز نئی زندگی ہوگی۔ لیکن ایسا نہیں ہے تو سمجھ لو کہ خودی مُردہ ہو چکی ہے۔

اگر امروز تو تصویرِ دوش است　　بخاکِ تو شرارِ زندگی نیست

پس مسلمان نوجوان اگر بیسویں صدی میں زندہ رہنے کا آرزومند ہے تو اُسے اپنی خودی کا جائزہ لینا چاہیئے کہ وہ زندہ ہے یا نہیں۔ انسان آمد و شد نفس سے عبارت نہیں، خواب و خورش زندگی کا ثبوت نہیں۔ کیونکہ یہ کام حیوانات بھی کرتے ہیں۔ انسان زندہ وُہ ہے جس کی خودی زندہ ہو، اور خودی کی حیات کا تسلسل تخلیق مقاصد پر منحصر ہے۔ اِس لئے ہر مسلمان نوجوان کے سامنے کوئی نصب العین (IDEAL) بھی ہونا ضروری ہے ؎

ما زِ تخلیقِ مقاصد زندہ ایم　　از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

اب سوال یہ ہے کہ وہ مقاصد کیا ہو؟

علامہ اس کا جواب دیتے ہیں کہ مسلمان کا نصب العین (IDEAL) دنیاوی نہیں ہوتا بلکہ سراسر نوری اور سماوی مسلمان کا نصب العین (IDEAL) ایسا ہی ہوتا ہے جو ما سوائے اللہ کو جلا کر خاک سیاہ کر دے، باطل کی ہستی کو

فنا کر دے اور اس قدر بلند ہو کہ آسمان بھی اس کی رفعت کے سامنے ہیچ ہو

مقصدے مثلِ سحر تابندہ اے ماسوا را آتشِ سوزندہ اے

مقصدے از آسماں بالا ترے دلربائے دلستانے دلبرے

مختصر یہ کہ مسلمان کا مقصد دنیا طلبی نہیں خدا طلبی ہوتا ہے۔ سہ

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے

یزداں بکمند آور اے ہمّتِ مردانہ



خلاصۂ مبحث اوّل

اب تک مفصلہ ذیل حقائق سامنے آچکے ہیں۔

(۱) خودی اصلِ نظامِ عالم ہے۔

(۲) تسلسلِ حیات استحکامِ خودی پر منحصر ہے۔

(۳) جمالِ معنوی کی تکمیل خونریزی کے بغیر ممکن نہیں۔

(۴) زندگی بقدرِ استواری ہے۔

(۵) خودی کی بقا، تخلیقِ مقاصد پر موقوف ہے۔

(۶) علم و فن دراصل زندگی کی حفاظت کا سامان ہے۔

مبحث دوم

خودی عشق و محبت سے مستحکم ہوتی ہے

اب ایک نئی بحث شروع ہوتی ہے وہ یہ کہ خودی مستحکم کیونکر ہوسکتی ہے علامہ نے اس اہم سوال کا جواب دیا ہے کہ خودی عشق و محبت سے استحکام اور پختگی حاصل کرسکتی ہے۔

از محبت می شود پائندہ تر　　زندہ تر سوزندہ تر تابندہ تر

رابطۂ عشق و خودی

اب سوال یہ ہے کہ خودی عشق سے کیوں مستحکم ہوتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ خودی کی فطرت کو عشق کے ساتھ اس قسم کا تعلق ہے کہ عشق اس کے جوہر کو مشتعل کردیتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خودی کی مخفی صلاحیتیں ارتقاء پذیر ہوجاتی ہیں اور ارتقاء اس کے استحکام کا باعث ہوتا ہے۔

از محبت اشتعالِ جوہرش　　ارتقائے ممکناتِ مضمرش

ماہیتِ عشق

تیسرا سوال یہ ہے کہ عشق کیا چیز ہے؟ علامہ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ عشق ایک لطیفۂ نوری ہے اس کی اصل مادی یا دنیاوی نہیں ہے اسی لئے اس کو تیغ و خنجر کا خوف بھی نہیں کیونکہ یہ چیزیں مادیات کو قطع کر سکتی ہیں نہ کہ نور کو عشق میں یہ طاقت ہے کہ اس کی ایک نگاہ غلط انداز سے سنگِ خارا بھی دو شق ہو جاتا ہے۔

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق ۔۔۔ عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات

چونکہ خودی کے استحکام کا دنیا میں صرف یہی ایک ذریعہ ہے اس لئے ہر مسلمان کو عاشقِ صادق بن جانا چاہیئے۔ اس کی آنکھ نوحؑ کی اور دل ایوبؑ کا سا ہونا چاہیئے۔

عشق را از تیغ و خنجر باک نیست ۔۔۔ اصلِ عشق از آب و باد و خاک نیست

کیفیتِ معشوق۔

چوتھا سوال یہ ہے کہ عشق کس سے کرنا چاہیئے؟ علامہ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ وہ معشوق خود مسلمان کے دل میں پوشیدہ ہے۔ اس کے عشق سے دل توانا ہے اور اس کا عاشق معشوقانِ عالم سے بھی زیادہ حسین ہوتا ہے۔ اس کے قدم کی برکت سے خاکِ حجاز، فلک الافلاک سے بھی بلند ہو گئی۔ وہ معشوق کون ہے؟ سرورِ انبیاء محبوبِ کبریا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم۔

در دلِ مسلم مقامِ مصطفےٰ است　　آبروئے ما ز نامِ مصطفےٰ است

اب اس معشوق کی تعریف علامہ ہی کی زبان سے سنئے۔

در شبستانِ حرا خلوت گزید　　قوم و آئین و حکومت آفرید

ماند شبہا چشمِ او محرومِ نوم　　تا بہ تختِ خسروی خوابید قوم

وقتِ ہیجا تیغِ او آہن گداز　　دیدۂ او اشکبار اندر نماز

در جہاں آئینِ نو آغاز کرد　　مسندِ اقوامِ پیشیں در نورد

در نگاہِ او یکے بالا و پست　　با غلامِ خویش بر یک خواں نشست

آنکہ بر اعدا، درِ رحمت کشاد　　مکہ را پیغامِ لاتثریب داد

امتیازاتِ نسب را پاک سوخت

آتشِ او ایں خس و خاشاک سوخت

اقبال کو ——————— اُس اقبال کو جسے اب تک اُس کی قوم نے کما حقہٗ سمجھنے کی کوشش نہیں کی، جس کی وجہ سے اُسے لکھنا پڑا۔

او چمن[1] زادے چمن پروردۂ　　من دمیدم از زمینِ مردۂ

جس کی قوم کے افراد اُس کے کلام کو سمجھنے کے بجائے اس کے کلام میں

---

[1] پیامِ مشرق میں علامہ موصوف نے گوئٹے (GOETHE) کی طرف اشارہ کرکے اپنی قوم کی بے حسی کا اظہار فرمایا ہے کہ "گوئٹے تو چمن میں پیدا ہوا اور چمن ہی میں پرورش پائی۔ لیکن میں مُردہ قوم میں پیدا ہوا ہوں۔"

تذکیر و تانیث، کی اغلاط ڈھونڈتے رہے ہیں ———— اس ذات قدسی صفات (صلعم) سے جو والہانہ شیفتگی اور محبّت ہے اس کی چاشنی بھی چکھ لیجئے

من چہ گویم از تولائش کہ چیست — خشک چوبے در فراقِ او گریست

ہستیٔ مُسلم تجلّیٰ گاہِ او — طورہا بالد ز گردِ راہِ او

پیکرم را آفرید آئینہ اش — صبحِ من از آفتابِ سینہ اش

خاکِ یثرب از دو عالم خوشتر است — اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است

عشق اور تقلید

عشق محمدی کی علامت کیا ہے؟ نالہ و فریاد؟ نہیں، آہ و فغاں؟ نہیں، اختر شماری اور بے قراری؟ نہیں! پھر کیا؟ تقلید یعنی اتباعِ کاملہ تقلید کرنے کا نتیجہ کیا ہوگا؟ خدا تمہارا ہو جائے گا۔ (کَمَا قَالَ اللّٰہُ تَعَالیٰ۔ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ)

عاشقی؟ محکم شو از تقلیدِ یار — تا کمندِ تو کند یزداں شکار

تقلید کی مثالیں۔

(۱) حضورؐ نے غارِ حرا میں خلوت اختیار فرمائی تھی اسی طرح تم بھی "حرائے دل" میں خلوت اختیار کرو۔

(۲) حضورؐ نے خود پرستی، خود بینی اور نفس امارہ کو ترک فرمایا۔ تم بھی ایسا ہی کرو۔

(۳) حضورؐ نے مکّہ سے ہجرت فرمائی تم بھی خدا کی طرف ہجرت کرو۔

(۴) حضورؐ کو اللہ کی ہستی کا زبردست یقین تھا جیسا کہ آپؐ نے صدیق اکبرؓ سے فرمایا "لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا" تم بھی اپنے اندر ایسا ہی یقین پیدا کرو۔

(۵) حضورؐ نے بُتوں کو توڑا۔ تم بھی ہوس کے بتوں کو توڑو۔ تو پھر کیا ہوگا؟ سُنیئے:۔

تا خدائے کعبہ بنوازد ترا   شرحِ اِنِّیْ جَاعِلٌ سازد ترا

یہ ہوگا کہ تم خلافت و نیابت الٰہیہ کے مرتبہ پر فائز ہو جاؤ گے۔



مبحث سوم

استحکامِ خودی کو کس طرح نقصان پہنچتا ہے

خودی وہ مرکزی نقطہ ہے جس پر انسان کو اپنی کامل توجہ مرکوز کرنی چاہئے
یہ جوہر جس طرح محبت سے مستحکم ہوتا ہے اسی طرح سوال کرنے سے اس میں ضعف
اور کمزوری پیدا ہو جاتی ہے اس لئے مسلمان کو سوال کرنا حرام ہے۔

خود فرود آ از شترِ مثلِ عمرؓ الحذر از منّتِ غیر الحذر

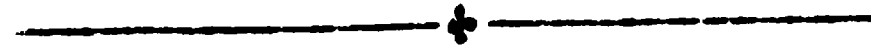
یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "اَلْکَاسِبُ
حَبِیْبُ اللّٰہ" یعنی جو شخص سوال نہ کرے بلکہ اپنی روزی خود کمائے وہ اللہ
کا حبیب ہے۔

آنحضرتؐ نے جو مسلمانوں کو سوال کرنے سے منع فرمایا اس کا فلسفہ یہی تو ہے
کہ سوال کرنے سے خودی ضعیف ہو جاتی ہے اور جس کی خودی ضعیف ہو گئی
وہ قیامت تک مرتبۂ خلافت و نیابتِ الٰہیہ پر فائز نہیں ہو سکتا اور جو اس

منصب پر نہیں پہنچ سکتا گویا اس کا مقصدِ حیات فوت ہو گیا اور جس کا مقصدِ حیات ہی فوت ہو گیا ہو اس کا عدم اور وجود دونوں ہی یکساں ہیں۔

اِسی لئے علّامہ نے لکھا ہے:۔

رزقِ خویش از نعمتِ دیگر مجو　　موجِ آب از چشمۂ خاور مجو
تا نباشی پیشِ پیغمبرؐ خجل
روزِ فردائے کہ باشد جاں گسل



مبحث چہارم

خودی کی نفی کا مسئلہ اقوامِ مغلوبہ کی اختراع ہے۔ وُہ اس طریق سے اقوامِ غالب کے پوشیدہ جوہروں کو کمزور کر دیتے ہیں

جب خودی عشق کی بدولت محکم ہو جاتی ہے تو نظامِ عالم کی ظاہری اور مخفی قوتوں کو مسخر کر لیتی ہے اور انسان میں خارقِ عادت قوتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ علاّمہ کہتے ہیں :-

پنجۂ او پنجۂ حق مے شود　　ماہ از انگشتِ او شق مے شود

در خصوماتِ جہاں گردد حکم　　تابعِ فرمانِ اُو دارا و جم

نفی خودی کا مسئلہ کس نے پیدا کیا ؟

یہ مسئلہ دراصل دُنیا میں، اقوامِ مغلوبہ نے پیدا کیا اور اُن کا مقصد یہ تھا کہ اس طریقہ سے، اقوامِ غالبہ کے اخلاقِ عالیہ کو ضعیف کیا جائے تاکہ اُن

کے غلبہ اور اقتدار سے رہائی نصیب ہو سکے۔

گوسفند کو لاکھ وعظ و پند کیجیے لیکن وہ اپنے اندر شیر کی صفات پیدا نہیں کر سکتی۔ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ شیر کو ایسے راستہ پر ڈال دیا جائے کہ وہ رفتہ رفتہ اپنی صفات کھو بیٹھے۔ لہٰذا اقوامِ مغلوبہ نے اقوامِ غالبہ کے سامنے یہ مسلک پیش کیا کہ

ہر کہ باشد تند و زور آور شقی است — زندگی مستحکم از نفیٔ خودی است
روحِ نیکاں از علف یابد غذا — تارک اللحم است مقبولِ خدا
جنّت از بہرِ ضعیفاں است و بس — قوّت از اسبابِ خسران است و بس
غافل از خود شو اگر فرزانۂ — گر ز خود غافل نۂ دیوانۂ

چشم بند و گوش بند و لب بہ بند
تا رسد فکرِ تو بر چرخِ بلند

جب اقوامِ غالبہ نے اس مسلکِ گوسفندی پر عمل کیا تو اُن کے اندر گوسفندوں کے خواص پیدا ہو گئے۔

دل بتدریج از میانِ سینہ رفت — جوہرِ آئینہ از آئینہ رفت
آں جنونِ کوششِ کامل نماند — آں تقاضائے عمل در دل نماند
اقتدار و عزم و استقلال رفت — اعتبار و عزت و اقبال رفت
زورِ تن کاہید و خوفِ جاں فزود — خوفِ جاں سرمایۂ ہمت ربود

صد مرض پیدا شد از بے ہمتی   کوتہ دستی، بے دلی، دوں فطرتی

شیر بیدار از فسونِ میش خُفت
انحطاطِ خویش را تہذیب گُفت

اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ تمثیل مسلمانوں کے حال پر پورے طور سے منطبق ہو سکتی ہے۔ قرآن شریف نے مسلمانوں کو شیروں کی صفات عطا کی تھیں اور ان کی صفات کی بدولت جبل الطارق سے لے کر وادیٔ گنگ تک اور کاشغر سے لے کر سراندیپ تک اُن کے نام کا سکّہ رواں تھا۔ لیکن جب انہوں نے مسلکِ گوسفندی پر عامل ہو کر اپنی خودی کی نفی کرنا اپنا شعارِ حیات بنا لیا (اور یہ مسلک قرآنی تعلیمات کی بالکل ضد تھا) تو اقتدار، عزم، استقلال، اعتبار، عزت اور اقبال، سب خوبیاں ایک ایک کر کے اُن سے رخصت ہو گئیں اور اُن کی وُہ حالت ہو گئی جو آج نظر آتی ہے۔ مولانا حالیؔ نے کیا خوب لکھا ہے:

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے   اسلام کا گر کر نہ اُبھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد   دریا کا ہمارے جو اُترنا دیکھے

(مسدس)

مبحث پنجم

افلاطونِ یونانی جس کے افکار سے اقوامِ اسلامیہ کا تصوّف اور ادبیات بہت متاثر ہیں، مسلکِ گوسفندی کا قائل ہے لہٰذا اُس کے تخیّلات سے احتراز کرنا چاہئے

اِس کے بعد علّامہ نے اپنی مثنوی میں جو باب باندھا ہے اس میں حسبِ ذیل حقائق پر روشنی ڈالی ہے۔

(۱) حکیم افلاطون یونانی نے اپنے فلسفہ میں مسلکِ گوسفندی کی اشاعت کی ہے یعنی عالمِ موجودات کا انکار اور عالمِ غیر محسوس کا اثبات کیا ہے جسے وہ عالمِ اعیان (THE WORLD OF IDEAS) کہتا ہے۔

(۲) اقوامِ اسلامیہ کے تصوّف اور ادبیاتِ عالیہ پر اس کے فلسفہ اور خیالات کا زبردست اثر مرتّب ہوا جس کی وجہ سے اُن میں قوتِ عمل افسردہ ہو

گئی اور وُہ دوسروں کے غلام بن گئے۔

(۳) لہٰذا دورِ حاضر کے مسلمانوں کو اس کے تخیلات سے اجتناب کرنا چاہیئے اور ان کے بجائے قرآن مجید کے فلسفۂ کائنات کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔

حکیم افلاطون ۴۲۷ق ۔م میں بمقام ایتھنز (ATHENS) پیدا ہُوا تھا۔ ۴۰۷ق ۔م میں سقراط کی شاگردی اختیار کی اور تادم وفات اس کی خدمت میں حاضر رہا۔ استاد کی وفات کے بعد کچھ عرصہ سیر و سیاحت میں بسر کیا اور ۳۸۶ق ۔م سے لے کر تادم آخر فلسفہ کا درس دیتا رہا ۳۴۷ق ۔م میں وفات پائی۔

مسئلہ اعیانِ نامشہود۔

افلاطون کے زمانہ سے پہلے حکمار کے درمیان یہ بحث جاری تھی کہ انسان، اشیائے کائنات کا علم حاصل کر سکتا ہے یا نہیں؟ افلاطون نے اس باب میں سقراط سے اتفاق رائے کیا کہ انسان اشیائے کائنات کا علم حاصل کر سکتا ہے لیکن محض کلیات (GENERAL IDEAS) تصوّرات (UNIVERSAL CONCEPTS) اور عالمگیر صداقتوں (TRUTHS) کے ذریعہ سے، اس کے ساتھ ساتھ اس نے اس باب میں ہرقلیطوس سے اتفاق رائے کیا کہ جو اشیار نظر آتی ہیں وُہ ہر لحظہ متغیر رہتی ہیں۔ اس لئے ان کے متعلق کوئی بات ایسی نہیں کہی جا سکتی جو عالمگیر

صداقت (UNIVERSAL TRUTH) بن سکے یا جس پر حقیقت ثانیہ کا اطلاق ہو سکے اس لئے وہ لامحالہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ تغیر پذیر اشیائے کائنات یعنی محسوسات (REAL OBJECTS OF KNOWLEDGE) نہیں ہیں۔ یعنی اس دُنیا کی جسے ہم حواس خمسہ سے محسوس کرتے ہیں اشیاء کا علم حقیقی یا اصلی نہیں ہے حقیقی علم صرف ان اشیاء کا ہے جن کو وہ اعیان (IDEAS) کہتا ہے۔

اس کا عقیدہ یہ تھا کہ حقیقی وجود انہی اعیان (IDEAS) کا ہے باقی اس دُنیا میں جو کچھ نظر آتا ہے وُہ لائق اعتبار نہیں ہے اور نہ اس میں حقیقت پائی جاتی ہے۔

اَب جو کچھ علامہ فرماتے ہیں اُسے پڑھئے۔

آں چناں افسونِ نامحسوس خورد　　اعتبار از دست و چشم و گوش بُرد
منکرِ ہنگامۂ موجود گشت　　خالقِ اعیانِ نامشہود گشت
عقلِ خود را بر سرِ گردوں رساند　　عالمِ اسباب را افسانہ خواند
فکرِ افلاطوں زیاں را سود گفت　　حکمتِ او بود را نابود گفت

یعنی افلاطون نے یہ نظریہ پیش کیا کہ یہ جو کچھ نظر آتا ہے اور حواس خمسہ سے محسوس ہوتا ہے حقیقی (REAL) نہیں ہے حقیقی وجود اس عالم کا ہے جو غیر محسوس اور غیر مشہود ہے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے فلسفہ کے متبعین نے اپنے

حواس خمسہ کی شہادت پر اعتبار کرنا چھوڑ دیا اور کہنے لگے کہ یہ دنیا مایا ہے ع

ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

وُہ اپنے فلسفہ کی رُو سے، اِس عالمِ موجود کا منکر ہو گیا اور اس نے محض اعیان (IDEAS) کا وجود تسلیم کیا جو غیر مشہود ہیں اور اُن کا وجود محض قیاسی ہے۔

خلاصۃ الکلام یہ کہ افلاطون نے ایسا نظریہ پیش کیا جس کی رُو سے کائنات موجودہ کی نفی ہو گی۔

قومہا از شکرِ او مسموم گشت　　خفت و از ذوقِ عمل محروم گشت

اقوامِ عالم اِس کے فلسفیانہ خیالات سے متاثر ہوئیں اور یہ عقیدہ اُن کے دلوں میں راسخ ہو گیا کہ یہ دنیا سراسر افسانہ ہے اس کی نہ کوئی اصلیت ہے نہ حقیقت اور نہ جو کچھ نظر آتا ہے لائقِ اعتبار ہے اس طرح رفتہ رفتہ وہ ذوقِ عمل سے محروم ہو گئیں اور خیالی دنیا میں زندگی بسر کرنے لگیں۔

اِس نظریہ کا انسان کی ذہنیت پر لازمی طور سے یہ اثر ہوگا کہ جب یہ دنیا سراسر افسانہ ہے تو پھر اس کے متعلقات مثلاً دولت حکومت، ملک و مال، خاندان، زن و فرزند سب بے حقیقت ہوں گے لہذا اُن کے حصول کی کوشش فضول ہے انسان کو چاہیئے کہ اپنی توجہ دُنیا اور دُنیاوی علائق سے یکسر منقطع کر کے اعیانِ نامشہود کی طرف مبذول کرے اور حقیقت کی جستجو میں زندگی بسر کرے۔

یہ رجحانِ طبع انسان کو لازمی طور سے رہبانیت کی طرف مائل کر دے گا اور جب کسی قوم میں راہبانہ خیالات پیدا ہو جائیں گے تو وہ تنازع للبقاء میں حصّہ لینے کی صلاحیت سے عاری ہو جائے گی بالفاظ دیگر اس میں گوسفندوں کی صفات پیدا ہو جائیں گی اور وہ دوسروں کی غلام بن جائے گی۔

تمام مسیحی مؤرخین کلیسا اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ابتدائی چند صدیوں میں کلیسا اور کلیسائی عقائد پر، مذہب افلاطون کا زبردست اثر پڑا۔ چنانچہ ابتدائی مشائخ کلیسا مثلاً جسٹن، آریجن، کلیمنٹ، اور آگسٹن یہ سب صدق دل سے فلسفۂ اشراق پر ایمان رکھتے تھے اور ان سبھوں نے رہبانیت کی تعلیم دی۔

اگرچہ آنحضرتؐ نے لَا رُهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ فرما کر افلاطونی خیالات کا سدِّباب فرما دیا لیکن جب اسلام ایران میں پہنچا تو وہاں کے مسلمانوں نے مجوسیت، ثنویت، اور افلاطونی خیالات سے متاثر ہو کر جہاں اسلام میں اور بہت سے رخنے پیدا کئے وہاں ایک زبردست عقیدہ "نفیِ خودی" کا اسلامی تصوّف میں داخل کر دیا اور یہ عقیدہ اس شدّومد کے ساتھ داخل ہوا کہ ایک ہزار سال کے بعد بھی ہمارے شعراء نفیِ خودی اور فنا کے اسی راگ کو الاپ رہے ہیں جس کو سب سے پہلے اوحدی کرمانی، بابا فغانی اور محمود شبستری نے الاپا تھا۔

فارسی اور اُردو کے تمام شعراء نے باستثنائے معدودے چند یہی تعلیم دی ہے کہ اپنی ہستی کو فنا کر دو کیونکہ ہستی سراسر دھوکا اور فریب ہے۔ ملاحظہ ہو:

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

ہندوستان میں مسلمانوں کے آنے سے پہلے شنکر آچاریہ نے نہایت

زور و شور کے ساتھ اسی عقیدہ کی اشاعت کی تھی کہ خودی کو فنا کرو تو خدا

ملے گا مسلمانوں نے جو قرآن کے پیغام سے غافل ہو چکے تھے اس خواب

آور نسخہ کو استعمال کرنا شروع کیا۔ ع

جب آنکھ کھلی گل کی تو موسم تھا خزاں کا

خالصہ شمشیر و قرآں را ببرد اندریں کشور مسلمانی بمرد

اصلاح ادبیاتِ اسلامیہ

کسی قوم کی اصلاح کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ پہلے اس کی قوتِ غور و فکر کی

اصلاح کی جائے اور اصلاحِ فکر کے لئے ضروری ہے کہ اس قوم کے سامنے

ایسا لٹریچر پیش کیا جائے جو اس کی ذہنیت میں انقلاب پیدا کرے اور وہ صحیح

طور پر غور و فکر کرنے لگے۔

آنحضرت صلعم نے بھی سب سے پہلے عربوں کے ذہن میں انقلاب پیدا کیا

اس کے بعد جیسا کہ سب کو معلوم ہے اُن کی دُنیا ہی پلٹ کر رکھ دی۔

میرا تو ایمان ہے کہ جب تک مسلمانوں میں ذہنی انقلاب پیدا نہیں ہوگا،

معاشرتی، سیاسی یا مذہبی انقلاب کبھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ اور نہ ذہنی انقلاب پیدا

کرنے کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ خواب آور لٹریچر کی جگہ، زندگی بخش لٹریچر اُن کے سامنے پیش کیا جائے، ایسا لٹریچر، جو اُن کی رگوں کے اندر منجمد خون کو از سرِ نو گرما دے، جو اُن میں زندگی کی لہر دوڑا دے، جو اُن کو رمزِ حیات سے آگاہ کر دے۔

افسوس ہے اُس قوم پر جس کے شعراء ہجر و وصال، زلف و خال، غازہ و گلگونہ، ناوکِ ناز، اور نگاہِ غلط انداز کی بھول بھلیوں میں گرفتار ہوں، کیونکہ وُہ اپنی قوم کو بھی اسی گردابِ فنا میں مبتلا کر دیں گے۔

شعرائے اسلام کا فرض ہے کہ وُہ خیالی دُنیا سے باہر نکل کر حقیقی دُنیا میں رہنا سیکھیں۔ اور گُل و بُلبل کے افسانے سُنانے کی جگہ قوم کے نوجوانوں کو ترقی کے اصول سکھائیں، چنانچہ علامہ شعراء کو مخاطب فرماتے ہیں۔

اے میانِ کیسہ اَت نقدِ سخن | بر عیارِ زندگی او را بزن
فکرِ صالح در اَدب می بایدت | رجعتے سوئے عرب می بایدت

قرنہا بر لالہ پا کوبیدہ ئی | عارض از شبنم چو گل شوئیدہ ئی
خویش را بر ریگ سوزاں ہم بزن | غوطہ اندر چشمۂ زمزم بزن

یُو۔پی کے شعراء کو بالخصوص علامہ کی نصیحت پر عمل پیرا ہونا چاہیئے جہاں ابھی تک طبائع ردیف و قافیہ کی قیود میں گرفتار ہیں اور ہر نئی ترکیب کو دیکھ کر ناک بھوں سُکیڑنے کی عادی ہیں، ضرورت ہے کہ اب ہم اُن بھول

بھسلیوں کے پنجہ سے نکل کر اس بات پر غور کریں کہ شاعر ہمارے لئے کیا پیغام لے کر آیا ہے اور اس کے کلام میں زندگی کا سامان موجود ہے یا نہیں ؟





مبحث ششم

خودی کی تربیت کے تین مراحل ہیں۔ مرحلۂ اوّل اطاعت، مرحلۂ دوم ضبطِ نفس، مرحلۂ سوم نیابتِ الٰہی

جب یہ ثابت ہو گیا کہ ترقی اور کامیابی تمام تر استحکام و تربیتِ خودی پر منحصر ہے تو اب قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہو گا کہ خودی کی تربیت کس نہج اور کس صورت سے کی جائے۔

علّامہ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ تربیتِ خودی کے تین مراحل (STAGES) ہیں۔ مرحلہ اوّل کا نام اطاعت ہے۔ مرحلہ دوم کا نام ضبطِ نفس ہے اور مرحلہ سوم کا نام نیابتِ الٰہی ہے۔ ذیل میں ان مراحل سہ گانہ کی تشریح درج کی جاتی ہے۔

مرحلۂ اوّل

اگر کوئی شخص اپنی خودی کی تربیت کا خواہاں ہے تو اُسے سب سے پہلے اطاعت کو شعارِ زندگی بنانا چاہئے اور فرائضِ منصبی کے ادا کرنے کو مقصدِ حیات سمجھنا چاہئے۔

واضح ہو کہ اطاعت اور ادائے فرض دونوں کا مطلب ایک ہی ہے لہذا مختصراً یوں کہہ سکتے ہیں کہ اطاعت تربیتِ خودی کے لئے پہلی اور لازمی شرط ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کس شخص کی فرمانبرداری یا اطاعت کی جائے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی۔

کس طرح؟ قرآن مجید خدا تعالیٰ کا عطا کردہ دستور العمل ہے اور دستور العمل کی اطاعت ہی دراصل خدا تعالےٰ کی اطاعت ہے۔

اس جگہ یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ قرآن مجید میں کئی جگہ مسلمانوں کو حضورِ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا حکم دیا گیا، یہ کیوں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آنحضرت صلعم کی اطاعت کا مطلب بھی یہی ہے کہ اس دستور العمل کی اطاعت کی جائے جو آپؐ نے دُنیا کو دیا۔

اسلام شخصیت پرستی سے بالاتر ہے۔ وُہ انسان کو خدا پرستی کی تعلیم دیتا ہے اور مسلمان صرف خدا کے حکم کا پابند ہے۔ رسوؐل کا حکم بھی خدا کا حکم ہوتا ہے اور آیہ قرآنی مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ اس پر دال ہے

مسلمان آنحضرتؐ کے نام پر اپنی جان قربان کرنا سعادتِ سرمدی یقین کرتا ہے۔ مگر اس لئے نہیں کہ آپؐ فلاں ابنِ فلاں کے بیٹے تھے بلکہ اِس لئے کہ آپؐ نے ہمیں قرآن مجید جیسی نعمت عطا کی۔

مسلمان اپنے ہادی برحق کو نہ خدا سمجھتے ہیں نہ خدا کا فرزند بلکہ عبدہٗ ورسولہٗ۔ اور واضح ہو کہ عبد اور عبدہٗ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ یہ وہ بلند مقام ہے جس کی رفعت کا اندازہ بھی دشوار ہے۔ علّامہ خود لکھتے ہیں۔

عبد دیگر عبدہٗ چیزے دِگر　　ما سراپا انتظار، او منتظر

اَب یہ اشعار پڑھئے۔

تو ہم از بارِ فرائض سرمتاب　　برخوری از عندہٗ حسن المآب

یعنی جس طرح اُشترِ صحرائی کمال صبر و استقلال کے ساتھ اپنے فرائضِ منصبی کو ادا کرتا ہے اِسی طرح اے انسان تُو بھی ادائے فرض میں کوتاہی نہ کر۔ اگر تُو اپنے فرض کو اچھی طرح ادا کرے گا اور اطاعت کو اپنا شعارِ زندگی بنائے گا تو یقیناً اللہ تعالےٰ تجھے اجرِ عظیم عطا فرمائے گا۔ جیسا کہ اُس نے قرآن مجید میں فرمایا ہے:۔

ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ؕ

(زن و فرزند، دولت مال اور ثروت دنیوی) یہ سب چیزیں

دنیاوی زندگی کی پونجی ہیں اور اللہ کے پاس (حیاتِ انسانی کا)
بہترین مقصد موجود ہے۔

در اطاعت کوش اے غفلت شعار　　می شود از جبر پیدا اختیار

یعنی اے غفلت شعار! اطاعت الٰہی میں سرگرمی دکھا۔ کیونکہ جبر ہی سے اختیار پیدا ہوتا ہے۔

FREEDOM IS BORN OUT OF OBEDIENCE

فلسفہ جبر و اختیار

حکیم الامتہ نے اس شعر میں ایک زبردست زندگی بخش حقیقت کا انکشاف فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ اگر مسلمان حکومت کے طالب ہیں تو انہیں اطاعت الٰہی کو اپنا شعار بنانا چاہیئے۔

می شود از جبر پیدا اختیار

مغربی اور مشرقی دونوں ممالک کے فلاسفہ اور حکماء میں صدیوں سے یہ بحث چلی آ رہی ہے کہ انسان مجبور ہے یا مختار؟ گزشتہ اڑھائی ہزار سال میں جو کچھ اس پر لکھا گیا ہے اس کا خلاصہ تین آراء میں منحصر کیا جاتا ہے:-

(الف) انسان مجبورِ محض ہے۔

(ب) انسان مختار ہے۔

(ج) انسان مختار بھی ہے مجبور بھی ہے۔

علامہ نے ان تینوں قیاسات سے بچ کر ایک نئی بات پیش کی ہے جو اُن کی جدّت طرازی اور اجتہادِ فکر کی ایک روشن دلیل ہے، بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ جبر و اختیار کی بحث کو اس طرح سلجھایا ہے کہ بے اختیار مرحبا کہنے کو دِل چاہتا ہے۔

ابتدائے آفرینش سے یہ سوال انسان کے دل میں پیدا ہوتا چلا آیا ہے کہ میں مجبور ہوں یا مختار؟ علامہ فرماتے ہیں کہ اگرچہ ہر انسان حالتِ جبر یہ پیدا ہوتا ہے اور پیدا ہونا ہی مجبوری کی دلیل ہے۔ لیکن اگر وہ اپنے دل پر جبر کر کے اطاعتِ الٰہی اختیار کرے تو انجام کار یہ رنگِ اطاعت اس میں شانِ اختیار پیدا کر دے گا۔

ہر انسان فطرتاً مختاری و حکمرانی کا آرزو مند ہے۔ علامہ نے اپنے فلسفہ میں اسے تکمیلِ آرزو کا نہایت سادہ اور یقینی طریقہ بتا دیا ہے کہ اگر تم حکومت (اختیار) کے آرزومند ہو تو خدائی دستور العمل (قرآن مجید) کی اطاعت کرو صاحبِ اختیار ہو جاؤ گے۔ گویا اوّل اطاعت بعدہٗ حکومت۔

اِس شعر میں جو جبر و اختیار کے لفظ آئے ہیں ان کے دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں جو میں نے اوپر بیان کئے، یعنی اختیار بمعنی حکومت اور جبر بمعنی اطاعت۔

اَب سوال یہ ہے کہ جبر سے اختیار کیونکہ پیدا ہو سکتا ہے؟

اگر جبر کے معنی اطاعت اور اختیار کے معنی حکومت کے لئے جائیں تو اس سوال کا جواب یہ ہوگا کہ حکومت کے لئے صلاحیت شرط اولیں ہے اور صلاحیت ایک زبردست ضابطہ (ڈسپلن) سے پیدا ہوتی ہے اور (DISCIPLINE) اطاعت ہی کا دوسرا نام ہے۔

حکومت وہ قوم کر سکتی ہے جس نے قومی و انفرادی سیرت (اخلاق) کی تکمیل کر لی ہو اور کیرکٹر کی تکمیل اس وقت تک ناممکن ہے جب تک ان اصولوں کی پابندی نہ کی جائے، جو انسانی کیرکٹر کو پختہ اور استوار کرتے ہیں اور اصولوں کی پابندی کا دوسرا نام اطاعت ہے۔

انگریزوں کو دیکھئے وُہ ربع مسکوں پہ حکمران ہیں۔ لیکن کیوں؟ کیا اس لئے کہ وُہ ابناء اللہ ہیں؟ ہرگز نہیں! کیا اس لئے کہ وہ سفید فام ہیں؟ ہرگز نہیں محض اس لئے کہ انہوں نے ایک (RIGID DISCIPLINE) شدید پابندیِ نظام کو اپنا شعارِ حیات بنا رکھا ہے، اور صدیوں سے وہ اس کے پابند چلے آرہے ہیں جس کی بنا پر ان کی قومی سیرت کی تکمیل ہو گئی اور اطاعت کا رنگ اُن کے رگ و پے میں سرایت کر گیا ہے۔

۷ اطاعت کی روح

اطاعت کی روح قربانی ہے اسی لئے اسلام کی بنیاد بھی قربانی پر رکھی گئی ہے ~

حسین و سادہ و رنگین ہے داستانِ حرم   نہائت[1] اس کی حسین ابتدا ہے اسمٰعیل

قربانی کے کیا معنی اور کس کی قربانی؟ دُنبوں اور بکریوں کی قربانی جو مسلمان صدیوں سے کرتے چلے آئے ہیں؟ وہ نہیں، بلکہ انفرادی خواہشات اور قلبی آرزوؤں کی قربانی، ذاتی اور شخصی راحت اور آرام کی قربانی، اور اولاد کی قربانی۔ دُنبوں کی قربانی سے کسی قوم کے افراد کی تعداد میں اضافہ ہو سکتا ہے لیکن قومی سیرت کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے اپنی قربانی درکار ہے۔ اطاعت کے معنی ہیں دوسروں کے احکام کو اپنی خواہشات پر مقدم کرنا مثلاً میرا دل یہ چاہتا ہے کہ عیش کروں لیکن قوم حکم دیتی ہے کہ نہیں، ساری زندگی سمندروں کی گہرائی معلوم کرنے میں صرف کرو تو مجھے اپنی خواہشات کو بالائے طاق رکھ دینا چاہیے۔ اطاعت کے معنی ہیں افراد کو قوم کی بہبود کے لئے قربان کر دینا۔ مثلاً جب ۱۸۵۷ء میں انگریز لفٹننٹ ولوبی (WILEOUGHBY) نے جو دِلّی میگزین کا انچارج تھا، یہ دیکھا کہ میگزین عنقریب ہمارے دشمنوں کے قبضہ میں آنے والا ہے تو وہ اور اس کے ساتھ بارہ[12] سپاہی سب کے سب بارود کو آگ لگا کر بھک سے اُڑ گئے اور اُڑتے اُڑتے حکومت ہند کا منشور اپنی قوم کے نام لکھ گئے۔

---

[1] نہایت یعنی انتہا۔

اطاعت سے کیا پیدا ہوتا ہے؟

اطاعت سے افراد میں یکسانیت کا رنگ پیدا ہوتا ہے کیونکہ ہر فرد ایک ہی مقصد کے حصول کے لئے ایک ہی ضابطہ کی پابندی کرتا ہے اور اس رنگِ یکسانیت سے "یک نگاہی" پیدا ہوتی ہے۔ یک نگاہی کیا چیز ہے؟ تمام افراد کا ایک ہی مقصد کے درپے ہونا۔

مُردۂ از یک نگاہی زندہ شو! بگزر از بے مرکزی پائندہ شو!

اور جب کوئی قوم زندہ ہو جاتی ہے تو پھر حکمرانی کیا دشوار ہے؟

آج اگر مسلمانوں کو حکومت حاصل ہو جائے تو جانتے ہو کیا ہوگا؟ ایک عالم دوسرے عالم کے خون کا پیاسا، ایک مذہبی جماعت دوسری جماعت سے برسرِ پیکار، اور ایک گروہ دوسرے گروہ کو فنا کرنے پر آمادہ نظر آئے گا یہی تو وجہ ہے کہ اس قوم سے حکومت چھین لی گئی۔

الغرض اختیار تکمیل اخلاقِ حسنہ پر موقوف ہے اور اخلاق کی تکمیل دستور العمل کی پابندی پر منحصر ہے اور اسی پابندی کا دوسرا نام اطاعت ہے۔

اگر جبر و اختیار کو مصطلحاتِ فلسفہ قرار دیا جائے تو پھر اس کے یہ معنی ہوں گے کہ فرض کر لیجئے! انسان مجبور ہے جیسا کہ وہ بعض امور میں نظر آتا ہے تو اب قدرتی طور سے ہر مجبور مختاری کا طالب ہے، پس حصولِ اختیار کی صورت یہ ہے کہ بحالتِ صبر پیشِ تسلیم خم کر دو۔

انسان کی عادت یہ ہے کہ وہ سرِ تسلیم خم کرنا نہیں چاہتا۔ ہر لحظہ طغیان اور سرکشی پر آمادہ رہتا ہے نتیجہ اس کا یہ نکلتا ہے کہ آخر دم تک اس میں شانِ اختیار پیدا نہیں ہوتی لیکن اگر انسان ایک مرتبہ اس عقیدہ پر جم جائے کہ میں ہمیشہ اللہ کی مشیّت کے سامنے سرِ تسلیم خم کروں گا کیونکہ اس کے علاوہ کسی میں نفع یا نقصان پہنچانے کی طاقت نہیں ہے تو اس استقامت کی بدولت اس میں ایک بات یہ پیدا ہو جائے گی۔ ع

پیشِ فرعونے سرش افگندہ نیست

یعنی یہ صفت اس کو بے خوف اور نڈر بنا دے گی جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ کبھی دُنیاوی طاقت سے مرعوب نہ ہو سکے گا اس کے اندر (WILL TO CONQUER) تسخیر کائنات کا بے پناہ جذبہ پیدا ہو جائے گا اور یہ جذبہ اس کے جبر کو اختیار میں تبدیل کر دے گا۔ یعنی اگرچہ خدا نے انسان کو مجبور بنایا ہے لیکن جب وہ انسان مسلک جبر پر عامل ہو کر اپنے اندر شانِ اختیار پیدا کرے گا اگر اس نے ایسا کر لیا تو خدا بھی اُسے مختار بنا دے گا اور اگرچہ بظاہر وہ مجبور ہی نظر آئے گا لیکن بباطن اس کی تلوار اقوام عالم کی قسمتوں کا فیصلہ کیا کرے گی۔

جبرِ خالدؓ عالمے برہم زند ۔۔۔ جبرِ ما بیخ و بُنِ ما بر کند

حضرت خالدؓ بھی ہماری طرح مجبور پیدا ہوئے تھے لیکن انہوں نے

غیر اللہ کا خوف دل سے نکال دیا اور سوائے خدا کے ساری کائنات کو ہیچ یقین کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غزوہ موتہ میں نو تلواریں ان کے ہاتھ سے ٹوٹ گریں اور ان ٹکڑوں نے قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں کے ٹکڑے کر دیئے۔

ہم بھی خالدؓ کی طرح مجبور پیدا ہوئے ہیں لیکن ہم نے اللہ تعالےٰ کے بجائے قوت فرمانروا کو اپنا معبود قرار دیا اور غیر اللہ کے خوف سے اپنی خودی کو مُردہ کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری پیشانیوں پر غلامی کا داغ لگا ہوا ہے اور تلوار کے ٹکڑوں کی جگہ ہماری جھولیوں میں بھیک کے ٹکڑے پڑے ہوئے ہیں۔

الغرض حضرت خالدؓ بھی مجبور تھے اور ہم بھی مجبور ہیں یعنی جہاں تک عقیدۂ جبر و اختیار کا سوال ہے ہمارے علماء اہل سنت یہی کہیں گے کہ دونوں مجبور ہیں۔ لیکن پھر کیا وجہ ہے کہ خالدؓ نے مجبوری کے باوجود سلطنتوں کے تختے اُلٹ کر رکھ دیئے اور ہم اپنی غلامی کی زنجیروں کو بھی نہیں توڑ سکتے۔

اس کی وجہ یہی ہے کہ خالدؓ کا طریق حیات کچھ اَور تھا ہمارا طریق حیات کچھ اَور ہے۔ خالدؓ کا مسلک تھا اطاعت، ہمارا مسلک ہے بغاوت! جب طریق حیات مختلف ہے تو نتائجِ حیات بھی لازمی طور پر مختلف ہوں گے۔

خالدؓ دستورِ الٰہی کی اطاعت کرتے تھے ہم دستورِ الٰہی کی خلاف ورزی کرتے ہیں پھر غلط کیا ہے جو اکبر لکھتے ہیں ؎

ہم میں باقی نہیں اَب خالدؓ جانباز کا رنگ ۔۔۔ دل پہ غالب ہے فقط حافظِ شیراز کا رنگ

مشاہدہ فطرت

کارگاہ فطرت پر نظر ڈالو ہر جگہ قانون کی پابندی یعنی اطاعت کا رنگ نظر آئے گا۔ ع

ذرّہ ذرّہ دہر کا زندانیِ تقدیر ہے

کارگاہِ فطرت میں جو چیز اطاعت نہیں کرتی وہ زندہ نہیں رہ سکتی۔ نباتات اطاعت کا سبق پڑھنا چھوڑ دے تو صفحۂ ہستی سے معدوم ہو جائے یہی حال حیوان اور انسان کا ہے، قانونِ قدرت ہے کہ پیاس لگے تو پانی پیا جائے جو ذی روح اِس قانون کی خلاف ورزی کرے گا سزا پائے گا، بچ نہیں سکتا۔ الغرض کائنات میں ساری ترقی پابندیِ آئین پر موقوف ہے۔ اب علّامہ کے اشعار پڑھئے۔

ہر کہ تسخیرِ مہ و پرویں کند — خویش را زنجیریِ آئیں کند

باد را زندانِ گُل خوشبو کند — قید، بُو را نافۂ آہو کند

می زند اختر سوئے منزل قدم — پیشِ آئینے سرِ تسلیم خم

قطرہ ہا۔ دریاست از آئین وصل — ذرّہ ہا صحراست۔ از آئین وصل

باطنِ ہر شے ز آئین قوی — تو چرا غافل ازیں ساماں روی

لہٰذا جب یہ حقیقت مسلّم ہے کہ اطاعت ہی سے حکومت اور اختیار حاصل ہو سکتا ہے اور آئین کی پابندی ہی سے سروری اور سرفرازی نصیب

ہوسکتی ہے تو پھر مسلمان کا فرض بالکل عیاں ہے کہ وُہ آئینِ خداوندی کا پابند ہوجائے اور آنحضرتؐ کے تلقین کردہ راستہ سے سرِمو انحراف نہ کرے۔

تاریخ اسلام شاہد ہے کہ جب تک مسلمانوں نے قرآن مجید کے احکام پر بلا چون وچرا عمل کیا وُہ دنیا میں سربلند رہے لیکن جب انہوں نے منشائے الٰہیہ میں تاویل شروع کردی اور قرآن مجید کے صریح احکام کو کھینچ تان کر اپنی منشا کے مطابق کرنے لگے، اسی وقت سے ان کا زوال شروع ہوگیا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں کو نہ تاتاریوں نے تباہ کیا، نہ فرنگیوں نے بلکہ اسی تاویل نے۔

اسی لئے مرشد رومؒ نے اس کو متنبہ کیا ہے ؎

می کنی تاویل حرفِ مکر را
خویش را تاویل کن نَے ذکر را

اور ہمارے زمانہ میں مولانائے رُومؒ کے معنوی شاگرد نے استاد کی نصیحت کو ان الفاظ میں پیش کیا۔

حکم دشوار است تاویلے مجو ۔۔۔ جُز بقلبِ خویش قندیلے مجو

حاصل کلام یہ کہ اگر مسلمان پھر زندہ ہونا چاہتے ہیں تو انہیں سب سے پہلے آئینِ الٰہی کا جُوا اپنی گردن پر رکھ لینا چاہئے اور احکامِ الٰہی کی بلا چون وچرا تعمیل کرنی واجب قرار دے لینی چاہئے۔

شکوہ سنجِ سختیِ آئیں مشو　　از حدودِ مصطفٰےؐ بیروں مشو

مرحلۂ دوم

تربیتِ خودی کا دوسرا مرحلہ ضبطِ نفس ہے اور اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ مرحلہ اطاعت کا منطقی نتیجہ ہے یعنی ضبطِ نفس صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ پہلے انسان کے اندر اطاعت کا مادہ پیدا ہو جائے جب ایک انسان اطاعتِ الٰہیہ کا خوگر ہو جائے گا تو اس کے اندر یہ صلاحیت پیدا ہو جائے گی کہ وہ اپنے نفس کو اطاعت کا درس دے سکے۔

نفس انسانی جس کی غیر تربیت یافتہ حالت کا نام نفسِ امّارہ ہے بالطبع خود پرور، خود پرست، خود بیں اور خود سر ہے؛ اس لئے انسان کا فرض ہے کہ وہ اس پر اقتدار اور غلبۂ تام حاصل کرے۔

جو شخص اپنے نفس پر حکومت نہیں کر سکتا لازمی ہے کہ اس کے علاوہ دوسری طاقتیں اس کے نفس پر حکمران ہو جائیں گی۔ مثلاً زید کا نفس دولت کا آرزومند ہے۔ اب اگر وہ اپنے نفس کو اس آرزو کے حصول سے باز نہیں رکھ سکتا تو رفتہ رفتہ حرص و طمع کا جذبہ اس پر مسلّط ہو جائے گا اور وہ ان خواہشات کا غلام بن جائے گا۔ اس کے علاوہ جب وہ اس آرزو کے حصول کی خاطر دوسروں کے

سامنے دستِ سوال دراز کرے گا تو وہ لوگ بھی اس کے حاکم بن جائیں گے اور وہ نفس کی خواہشات کی بدولت ان لوگوں کا بھی غلام بن جائے گا۔

ہر کہ بر خود نیست فرمانش رواں   می شود فرماں پذیر از دیگراں

نفسیاتی زاویہ نگاہ سے دیکھا جائے تو انسان کی فطرت دو چیزوں سے مرکب ہے۔ خوف اور محبّت۔

خوفِ دنیا، خوفِ عقبےٰ، خوفِ جاں   خوفِ آلامِ زمین و آسماں
حُبِّ مال و دولت و حُبِّ وطن   حُبِّ خویش و اقربا و حُبِّ زن

نفس انسانی کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوا کہ دو جذبات اس پر مسلّط ہیں یا تو وہ بعض چیزوں سے خوف کھاتا ہے یا بعض چیزوں سے محبّت۔ یہی دو باتیں انسانی ترقی میں حائل ہیں۔ اس لئے علامہ نے ان دونوں پر غالب آنے کا طریقہ بتایا ہے۔

تا عصائے لا الٰہ داری بدست   ہر طلسمِ خوف را خواہی شکست

یعنی توحید کا عصا ہاتھ میں لے کر اس کی مدد سے مسلمان خوف کے سارے طلسموں کو آنِ واحد میں توڑ سکتا ہے اور اسی کلمہ توحید پر عامل ہونے سے فرزند و زن اور مال و دولت کی محبت سے رہائی مل سکتی ہے۔

ہر کہ در اقلیمِ لا آباد شد   فارغ از بندِ زن و اولاد شد

اگر مسلمان صدقِ دل سے اس بات پر ایمان لے آئے کہ خدا کے

علاوہ اور کوئی طاقت اُسے نفع یا نقصان نہیں پہنچا سکتی تو پھر دنیا میں وہ کسی طاقت سے مرعوب نہیں ہو سکتا۔

جنگ قادسیہ سے پہلے جب ایرانی فوج کے سپہ سالار نے مسلمان سفراء کو اپنے دربار میں طلب کیا تھا تو وہ اس شانِ استغنا کے ساتھ بھرے دربار میں رستم کے سامنے آئے تھے کہ خود دیکھنے والوں پر ان کی ہیبت کا سکہ جم گیا تھا سوال یہ ہے کہ ان میں یہ شان کس وجہ سے پیدا ہو گئی تھی ؟ محض اس وجہ سے کہ ان کے دل میں غیر اللہ کا خوف مطلق باقی نہیں رہا تھا۔

خوف را در سینۂ او راہ نیست　　خاطرش مرعوبِ غیر اللہ نیست

اسی طرح مسلمان اگر ماسوا اللہ اپنا رشتہ قطع کر کے صرف خدائے واحد سے پیمانِ محبت استوار کرے تو پھر کسی چیز کی محبت اس کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی۔ وہ خدا کے حکم کی تعمیل میں نہ بیٹے کی پرواہ کرے گا نہ بیوی کی۔

می کند از ماسوا قطع نظر　　می نہد ساطور بر حلقِ پسر

حضرت ابراہیمؑ نے بلا تامل اپنے بیٹے کی گردن پر چھری رکھ دی تھی۔ کیا انہیں اپنے بیٹے سے محبت نہ تھی ؟ ضرور تھی مگر ان کی محبتِ اولاد محبتِ الٰہی کے تابع تھی۔ بیٹا بے شک ایک عزیز متاع ہے لیکن حکمِ خدا کے سامنے اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

اپنی جان انسان کو سب سے پیاری ہوتی ہے۔ لیکن موحّد وہ ہے جو خدا

کی راہ میں اپنی جان قربان کرنے سے بھی دریغ نہ کرے۔

بایکے مثل ہجوم لشکر است — جاں بچشم او ز باد ارزاں تر است

جب لوگوں نے حضرت جعفرؓ بن ابی طالب کے جسم پر زخموں کے نشانات شمار کیئے تو ستر سے بھی زیادہ تھے۔ کس چیز نے ان کو اس قدر زخم کھانے کی طاقت بخشی تھی؟ صرف اس بات نے کہ خدا تعالیٰ کا حکم جان سے بھی زیادہ عزیز تھا۔

امام ابن تیمیہؒ اور امام ابن حنبلؒ نے جو صعوبات برداشت کیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں، کس بات نے ان کو اس قدر دلیر بنایا تھا؟ سنئے:۔

ہر کہ حق باشد چو جاں اندر تنش — خم نہ گردد پیش باطل گردنش

ارکانِ اسلام

عقیدۂ توحید کے بعد اسلام نے جو ارکان مقرر فرمائے ہیں ان سب کا مقصد بھی یہی ہے کہ مسلمان کے اندر ضبطِ نفس کی طاقت پیدا ہو جائے۔

نماز

لا الٰہ باشد صدف گوہر نماز
قلب مسلم را حج اصغر نماز

در کفِ مسلم مثالِ خنجر است
قاتلِ فحشاء و بغی منکر است

روزہ

روزہ بر جوع و عطش شبخوں زند
خیبرِ تن پروری را بشکند

حج

مومناں را فطرت افروز است حج
ہجرت آموز و وطن سوز است حج

زکوٰۃ

حُبِّ دولت را فنا سازد زکوٰۃ
ہم مساوات آشنا سازد زکوٰۃ

الغرض ارکان خمسہ توحید، صلوٰۃ، روزہ، زکوٰۃ اور حج خدا تعالےٰ نے اسی لئے فرض قرار دیئے ہیں کہ ان کی مدد سے مسلمان اپنے نفس پر غلبہ حاصل کر سکتا ہے۔

ایں ہمہ اسباب استحکامِ تُست
پختہ محکم اگر اسلامِ تُست

مرحلہ سوم

جب ایک مسلمان دونوں مراحل سے گزر جائے گا تو پھر وہ نیابتِ الٰہی کے مرتبہ پہ فائز ہو جائے گا۔

نائب کون اور کیا ہوتا ہے اس کے متعلق علامہ نے حسبِ ذیل حقائق کا اظہار فرمایا ہے۔

نائبِ حق ہمچو جانِ عالم است — ہستیٔ او ظلِ اسمِ اعظم است
از رموزِ جزو و کُل آگاہ بُود — در جہاں قائم بامر اللہ بُود
پختہ سازد فطرتِ ہر خام را — از حرم بیروں کند اصنام را
نوعِ انساں را بشیر و ہم نذیر — ہم سپاہی ہم سپہ گر ہم امیر
ذاتِ او توجیہ ذاتِ عالم است — از جلالِ او نجاتِ عالم است

زندگی را می کند تفسیرِ نو
می دہد ایں خواب را تعبیرِ نو

یعنی نائب حق، روح عالم کی مانند ہوتا ہے۔ اس کی ذات سے دُنیا زندگی حاصل کرتی ہے۔ یعنی دُنیا کے لوگ روحانی زندگی پاتے ہیں اور اس کی ہستی اسم اعظم کا ظل یا پَرتو ہوتی ہے یعنی اس کی ذات میں خدا کی صفات کا رنگ جھلکتا ہے۔ وہ نظام عالم کے اسرار اور رموز سے آگاہ ہوتا ہے! ور

دُنیا میں خدا کے حکم سے قائم ہوتا ہے۔ اس کی صحبت کے فیض سے خام طبع لوگ مراتبِ عالیہ پر پہنچ جاتے ہیں۔ اور وہ اپنی روحانی قوت سے لوگوں کو توحید کے مقام پر پہنچا دیتا ہے یعنی لوگوں کو حقیقی معنوں میں مسلمان بنا دیتا ہے گمراہوں کو راہِ راست دکھا دیتا ہے اور لوگوں کو زندگی کے حقیقی مفہوم سے آگاہ کرتا ہے۔

اس کے بعد علّامہ اس امر کی آرزو کرتے ہیں کہ موجودہ دَور میں اس شان کا کوئی شخص دنیائے اسلام میں پیدا ہو، جو مسلمانوں کو دوبارہ اخوّت کا سبق پڑھائے اور ان میں اُلفت و محبّت کا بیج بوئے، اور دُنیا میں امن قائم کرے۔

اے سوارِ اشہبِ دَوراں بیا　　اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا
شورشِ اقوام را خاموش کُن　　نغمۂ خود را بہشتِ گوش کُن
خیز و قانونِ اخوّت ساز دِہ　　جامِ صہبائے محبّت باز دِہ
باز در عالم بیار ایّامِ صلح!　　جنگجویاں را بدہ پیغامِ صلح!
سجدہ ہائے طفلک و برنا و پیر
از جبینِ شرمسارِ ما بگیر

مبحث ہفتم

شرح اسمائے علیؓ مرتضٰے

خودی کی تربیت کے مراحل سہ گانہ کی تفصیل بیان کرنے کے بعد، اب علامہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جس بندۂ حق بیں کی خودی بیدار ہو جاتی ہے وہ کس مرتبۂ عالیہ پر فائز ہو جاتا ہے اور اس مقصد کے لئے انہوں نے ہادیٔ برحق، سرورِ کائنات حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے شاگردوں میں سے ایک قابل شاگرد کو بطور نمونہ منتخب کیا ہے جن کے سوانح حیات کا بامعان نظر مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے کہ جس طرح آنحضرت صلعم کی ذات بابرکات میں تمام انبیاء کے کمالات جمع ہو گئے تھے آنحضرتؐ کے اس شاگرد کی ذات میں تمام انسانی کمالات یکجا نظر آتے ہیں۔

اگر کوئی شخص مجھ سے پوچھے کہ خدا کا سب سے بڑا معجزہ کیا ہے تو میں

بلا تامل جواب دوں گا، ذاتِ محمدیؐ (روحی لہٗ الفدا) اور اگر وہ یہ سوال کرے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا معجزہ کیا ہے تو میں کہوں گا علی مرتضیٰؓ۔ اگر شاگرد کے کمالات اس کے استاد کی عظمت شان پر دلالت کرسکتے ہیں تو بلاشبہ حضرت علیؓ کے کمالاتِ معنوی و روحانی، سرکارِ دو عالمؐ کی جلالت و عظمت کا اندازہ کرنے میں بڑی حد تک ہمارے معاون ہو سکتے ہیں۔ ع

قیاس کن ز گلستانِ من بہارِ مرا

مُسلمِ اوّل شہِ مرداں علیؓ عشق را سرمایہ ایماں علیؓ

علّامہ نے حضرت علیؓ کو "مسلم اوّل" قرار دیا ہے۔ یہ اولیّت باعتبار تقدیم و تاخیر نہیں ہے بلکہ بلحاظ عظمت و شرف ہے ٹھیک جس طرح قرآن مجید نے حضور انورؐ کو "اول المسلمین" کا لقب عنایت کیا گیا ہے۔ انگریزی میں اس کا ترجمہ FIRST (FOREMOST MUSLIM) ہوگا نہ کہ (MUSLIM یعنی حضرت علیؓ عظمت ایمانی کے لحاظ سے سب پر فوقیت رکھتے ہیں۔

دوسری صفت یہ بیان کی ہے کہ ان کی ذات عشق کے لئے سرمایۂ ایمان ہے۔ یعنی اگر کسی مسلمان کو اُن سے عشق نہ ہو تو اس کا ایمان ناقص ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کا قدم عشقِ رسولؐ میں سب سے آگے ہے۔ پس جو شخص عشقِ رسول کا مدعی ہو، اور اسے علیؓ سے محبت نہ ہو تو اُس کے معنی یہ ہیں کہ وہ

مقامِ عشق ہی سے بے خبر ہے۔ علیؓ کی ذات تو عاشقانِ رسولؐ کے لئے عاشقی کا روشن ترین نمونہ ہے مسلمان کی اسلامی زندگی اس پر منحصر ہے کہ وہ ذاتِ رسولؐ کو اپنے لئے اسوۂ حسنہ قرار دے اور جب تک عشق نہ ہو اتباع نہیں ہو سکتی۔ اور عشق کیونکر کرنا چاہئے یا عاشق کیسے ہوتے ہیں۔ اس کے لئے علیؓ کی سیرت کو اسوہ اور نمونہ بنانا چاہئے۔ لہذا ہر عاشقِ رسولؐ کے لئے علیؓ سے محبت کرنا بھی لازمی ٹھہرا۔

حضرت علیؓ کی تمام سیرت عشقِ رسولؐ کی ایک زندہ تصویر ہے میں صرف دو واقعے اس جگہ نقل کروں گا ع

قیاس مسمّٰی ازیں اسم گیر

(۱) جب کفارِ مکہ کے مطالبہ پر آنحضرتؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ "میرے نام کے آگے جو رسول اللہ لکھا ہے اسے مٹا دو" تو انہوں نے جواب دیا کہ "آپؐ کے ادنیٰ اشارہ پر اپنی گردن کٹانے کے لئے تیار ہوں لیکن مجبور ہوں کہ اس حکم کی تعمیل نہیں کر سکتا"۔ چنانچہ آنحضرتؐ نے خود اپنے ہاتھ سے ان الفاظ کو مٹایا

(۲) ایک دفعہ حضرت علیؓ چند صحابہؓ کے ساتھ کہیں جا رہے تھے۔ راہ میں ایک درخت پڑا جب اس کی شاخ کے نیچے سے گزرے تو اگرچہ وہ اُن کے سر سے کافی اونچی تھی تاہم وہ جھک گئے۔ لوگوں نے اس کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ "یہ سچ ہے کہ مجھے جھکنے کی کوئی ضرورت نہ تھی کیونکہ وہ شاخ

سر سے اونچی تھی، لیکن کیا کروں، میں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ اسی راہ سے جا رہے تھے تو آنحضرتؐ اس شاخ کے نیچے سے جھک کر نکلے تھے"۔

قصہ مختصر حضرت علیؓ عاشقانِ رسولؐ کے لئے ایک زندہ نمونہ ہیں، اور ان سے محبّت کرنا لازمی ہے۔ اسی لئے علّامہ فرماتے ہیں۔

از ولائے دُودمانش زندہ ام   در جہاں مثلِ گُہر تابندہ ام

علّامہ فرماتے ہیں کہ میں علیؓ کے خاندان کی محبّت سے زندہ ہوں اس زندگی سے مراد جسمانی زندگی نہیں کیونکہ اس قسم کی زندگی بغیر کسی قسم کی محبت کے بھی بسر کی جا سکتی ہے بلکہ روحانی زندگی یا بصیرت مراد ہے۔

---

(۲) اس کے بعد علّامہ نے حضرت علیؓ کے دو القاب کا تذکرہ فرمایا ہے۔

مُرسلِ حق کرد نامش بُوتراب   حق یداللہ خواند در اُمّ الکتاب

اور اس ضمن میں بوتراب کا فلسفہ بیان فرمایا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کا سب سے بڑا دشمن یا مخالف جسم یا مادہ ہے جسے علّامہ نے "خاکِ تاریک" سے تعبیر فرمایا ہے۔ یہ خاکِ تاریک یا (MATTER) تمام آفتوں کی جڑ ہے نفسِ امّارہ اسی کی منظم صورت کا دوسرا نام ہے۔ علّامہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو "ابوتراب" کا لقب دراصل اس لئے دیا تھا کہ انہوں نے مٹی یا مادہ پر کامل فتح حاصل کر لی تھی جسم اور جسمانی خواہشات کو مسخر

کر لیا تھا۔

شیر حق ایں خاک را تسخیر کرد　　　ایں گِل تاریک را اکسیر کرد
مرتضیٰ کز تیغ او حق روشن است　　　"بوتراب" از فتح اقلیم تن است

علامہ فرماتے ہیں کہ جو شخص جسم یا مادہ پر غالب آجاتا ہے وہ معجزات دکھا سکتا ہے۔ یعنی عناصر کائنات پر حکمراں ہو سکتا ہے۔

ہر کہ در آفاق گردد بوتراب　　　باز گرداند ز مغرب آفتاب
زیرِ پاش اینجا شکوہِ خیبر است　　　دستِ او آنجا قسیمِ کوثر است
ذاتِ او دروازۂ شہرِ علوم　　　زیرِ فرمانش حجاز و چین و روم

اب یہاں سے علامہ گریز اختیار کر کے اصل حقیقت کی طرف آتے ہیں یعنی مسلمانوں کو اُن کا بھولا ہوا سبق یاد دلاتے ہیں۔

(۱) فرماتے ہیں کہ خاک ہو جانا تو پروانوں کا شیوہ ہے نہ کہ مسلمانوں کا۔ مردانگی یہ نہیں کہ آدمی مٹ جائے یا فنا ہو جائے یا خاک بن جائے، مردانگی یہ ہے کہ مسلمان مٹی یا خاک (مادہ) کا باپ (فرمانروا) بن جائے۔

خاک گشتن مذہب پروانگی است　　　خاک را آب شو کہ ایں مردانگی است

پھر فرماتے ہیں کہ نازک مزاجی، نازک دماغی اور ہر قسم کی نزاکت چھوڑ دو اور فولاد بن جاؤ، سنگ خارا بن جاؤ، تاکہ کوئی دشمن زیر نہ کر سکے۔ اگر ایسا نہ کرو گے تو طاقتور قومیں تمہیں ہڑپ کر جائیں گی۔

یہی تعلیم علامہ نے ۱۹۳۲ء میں دی تھی۔ چنانچہ خطبۂ صدارت آل انڈیا مسلم کانفرنس لاہور میں فرماتے ہیں: "مسولینی کہتا ہے، فولاد فراہم کرو، میں کہتا ہوں خود فولاد بن جاؤ"

اس قوم کو فولاد کی حاجت نہیں رہتی
ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد

اگر یہ معلوم کرنا چاہو کہ خودی فولاد کیونکر بن جاتی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایمان کی بدولت یہ نعمت نصیب ہو سکتی ہے۔

(۲) زندگی عمل کا نام ہے اور زندگی کا قانون جس کی پابندی، ہر اس شخص پر لازمی ہے جو زندہ رہنے کا طالب ہے، یہ ہے کہ اپنے اندر تخلیق کی لذت پیدا کرو۔ اس لئے مسلمان اگر زندہ رہنے کے آرزومند ہیں تو انہیں نئی دُنیا پیدا کرنی چاہئے، اگر موجودہ دُنیا اُن کی منشاء کے مطابق نہیں ہے تو اُسے زیروزبر کر دیں، اور اسی کوشش میں جان دے دیں۔

در عمل پوشیدہ مضمونِ حیات — لذّتِ تخلیق، قانونِ حیات
مرد خود دارے کہ باشد پختہ کار — با مزاجِ او بسازد روزگار
گر نہ سازد با مزاجِ او جہاں — می شود جنگ آزما با آسماں
درجہاں نتواں اگر مردانہ زیست — ہمچو مرداں جاں سپردن زندگیست

علامہ کے مسلک میں لذّتِ تخلیق اس قدر اہم ہے کہ معیار کفر و اسلام ہے

چنانچہ جاوید نامہ میں بزبانِ خداوندی یوں کہتے ہیں۔

ہر کہ او را قوّتِ تخلیق نیست
نزدِ ما جز کافر و زندیق نیست

مسلمان کی زندگی کی صورتیں صرف دو ہیں۔ تیسری کوئی نہیں ہے۔ یا تو وہ زمانہ کو اپنے مزاج کے مطابق بنالیتا ہے یا اس کوشش میں جان دے دیتا ہے۔ زمانہ کے ساتھ مطابقت کرنا اس کا شیوہ نہیں۔

پہلے ٹائپ کی مثال موجودہ زمانہ میں ہمیں غازی مصطفےٰ کمال کی زندگی میں مل سکتی ہے۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ ۱۹۱۹ء میں ساری دُنیا اُن کے خلاف تھی، بیگانے تو خیر اُن کے دشمن تھے ہی، اپنوں نے بھی اُن کا خون حلال قرار دے دیا تھا! نہ اُن کے پاس فوج تھی نہ سپاہ، نہ طیارے، نہ آبدوز کشتیاں، نہ مال نہ سامان، لیکن وہ اور ان کے ہمراہی حقیقی معنی میں مومن تھے ؎

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

اس لئے ۹ ستمبر ۱۹۲۲ء کو یعنی تین سال کی قلیل مدت میں انہوں نے سمرنا فتح کر کے، نئی زمین اور نیا آسمان پیدا کر دیا جو اُن کے مطابقِ حال تھا۔

می کند از قوّتِ خود آشکار روزگارِ نو کہ باشد سازگار

دوسرے ٹائپ کی مثال ہمیں سلطان غازی حضرت ٹیپو شہید کی زندگی

میں نظر آتی ہے۔ غلامی قبول کر لینے کے لئے کوئی جتن ایسا نہ تھا جو ہمارے "دیرینہ دوستوں" نے اٹھا رکھا ہو۔ حد یہ ہے کہ لارڈ ولزلی نے "باب عالی" سے سفارشی خط منگوا کر اس مرد خود آگاہ کی خدمت میں بھجوایا۔ مگر اس نے اس کے جواب میں صرف اتنا ہی کہا کہ ع

یک دم شیرے بہ از صد سال میش

آخری لمحاتِ زندگی میں، جب ۶ مئی ۱۷۹۹ء کو دن کے دو بجے غدار اکبر صادق علیہ ما علیہ کی سازشوں کی بدولت قلعہ کی دیوار میں رخنہ پیدا ہو گیا تو "مریدانِ ابلیس" نے شیر سے کہا کہ حضور اب مناسب یہی ہے کہ آپ ہتھیار ڈال دیں تا کہ دشمنوں کی "جان" پر کوئی بلا نازل نہ ہو۔ انگریز بڑے "شریف، فیاض الطبع اور وسیع القلب ہیں" تو اس نے فوراً اس مقام کا رخ کیا، جہاں رخنہ پڑ گیا تھا اور اس بے جگری کے ساتھ دشمنوں کا مقابلہ کیا کہ رہتی دنیا تک یادگار رہے گا۔ تین گولیاں جسم میں پیوست ہو چکی تھیں مگر تلوار کی کاٹ میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ بالآخر جب زخموں سے چُور ہو کر کشتوں کے پُشتہ پر گرا، تو ایک انگریز سپاہی نے یہ سمجھ کر کہ شیر مردہ ہے، اس کی جواہر نگار پیٹی پر ہاتھ ڈالا ٹیپو نے خون آلود نگاہوں سے اُس "شریف اور فیاض" سپاہی کی طرف دیکھا، اور لیٹے ہی لیٹے خون آلود تلوار کا ایک ہاتھ رسید کیا جو اُس کے گھٹنے پر لگا۔ گویا شیر نے زبانِ شمشیر سے اس کو اس حقیقتِ عظمیٰ سے آگاہ کر دیا کہ شیر ہیں جب تک

زندگی کی اونٹے سے رمق بھی باقی رہتی ہے کوئی لومڑی اس پر متصرف نہیں ہو سکتی۔ اس سپاہی کو بقول مؤرخ بہت غصہ آیا اور اس نے فوراً اپنی بھری ہوئی قرابین چھیتیا لیں۔ یہ چوتھی گولی کنپٹی میں لگی، اور شیر ٹھنڈا ہو گیا۔

جب رات کے ۹ بجے شہید کی نعش کشتوں کے انبار میں سے ڈھونڈھ کر نکالی گئی، تو خون آلود تلوار ہنوز اس کے خون آلود ہاتھ میں موجود تھی اور حقیقت میں آنکھیں اسی طرح کھلی ہوئی تھیں، گویا زبانِ حال سے کہہ رہی تھیں کہ

"خبردار! نگاہ روبرو! شیر سو رہا ہے۔

یہ ہے مسلمان کی زندگی اور یہ ہے مسلمان کی موت! جب تک وہ زندہ رہا باطل اس کے نام سے لرزہ براندام رہا اور جب وہ مرگیا تو اس کے اشد ترین دشمنوں نے بھی اس کی شجاعت اور جوانمردی کا اعتراف کیا۔

وَالْفَضْلُ مَا شَهِدَتْ بِهَا الْاَعْدَآءُ۔

ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ جب تین گولیاں اور بے شمار زخم کھا کر ٹیپو گر ہی پڑا تھا اور چند سانسوں ہی کا مہمان تھا، تو اس نے کیوں اس سپاہی پر وار کیا؟ اُس نے کیوں نہ یہ سوچا کہ میں تو اب چند لمحوں کا مہمان ہوں، عنقریب مرجاؤں گا اور مرنے کے بعد میری جواہر نگار پٹی اور پر تلہ اور مرصع تلوار اور دیگر جواہرات لامحالہ دشمنوں کے ہاتھ آجائیں گے، لہٰذا اس سپاہی کو زخمی کرنے سے یا اس پر تلوار

اُٹھانے سے کیا فائدہ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس تصور کا دماغ میں پیدا ہونا ممکن تو بے شک ہے مگر یہ تصور نامردوں اور بُزدلوں کے دماغ میں پیدا ہؤا کرتا ہے جوانمردوں کے دماغ میں اس ننگِ انسانیّت تصوّر کی گنجائش نہیں ہے "مردِ خود دار" آخری سانس تک مقابلہ کیا کرتا ہے کیونکہ دشمن کے سامنے سپر اندازی اس کے مذہب میں اشد ترین کفر ہے۔

قارئین کرام کی خدمت میں اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ شہیدؒ کی نعش جب دستیاب ہوئی تو نیم برہنہ تھی، اگر پاجامہ میں کوئی قیمتی پتھر لگا ہؤا ہوتا تو شاید "شریف دشمن" اُسے بھی اُتار لیتا۔

قصّہ مختصر قرآن یا اسلام نے اسلامی زندگی کی فقط یہ دو صورتیں ہی بتائی ہیں، یا مردوں کی طرح زندگی بسر کرنا (مصطفٰے کمال) یا مردوں کی طرح میدانِ جنگ میں سُرخرو ہونا (ٹیپو شہیدؒ) تیسری کوئی صُورت نہیں ہے۔ اور ہندوستان کے نو کروڑ مسلمان جس صورت زندگی بسر کر رہے ہیں وہ اسلامی صورت نہیں ہے۔

صغریٰ

غلامی کی زندگی اسلام کے خلاف ہے۔

کبریٰ

ہندی مسلمان غلامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

نتیجہ۔ ہندی مسلمانوں کی زندگی خلافِ اسلام ہے۔

غالباً اِس منطقی ثبوت کے بعد اِس مضمون کے پڑھنے والوں کے دماغ میں کوئی سفسطہ یا مغالطہ پیدا نہیں ہوگا۔

اب مکرّر اسرارِ خودی کے اِن اشعار کو پڑھئے۔

گر نہ سازد با مزاج او جہاں   می شود جنگ آزما با آسماں
برکَنَد بنیادِ موجودات را   می دہد ترکیبِ نو ذرّات را
گردشِ ایّام را برہم زند   چرخِ نیلی فام را برہم زند
می کُند از قوّتِ خود آشکار   روزگارِ نَو کہ باشد سازگار

در جہاں نتواں اگر مردانہ زیست
ہمچو مرداں جاں سپردن زندگیست

(۳) زندگی کی اصلیّت اور اس کی بنیاد آمد و شدِ نفس پر نہیں بلکہ ذوقِ استیلاء یعنی غلبہ کی خواہش پر ہے۔

زندگانی قوّتِ پیدا ستے   اصلِ او از ذوقِ استیلا ستے

(۴) جو شخص دوں ہمت اور پست فطرت ہے وہ قعرِ ذلّت میں پڑا رہتا ہے اور اپنی ناتوانی کا نام قناعت رکھ کر اپنے نفس کو مبتلائے فریب رکھتا ہے حالانکہ ناتوانی زندگی کی سب سے بڑی دشمن ہے۔

ناتوانی زندگی را رہزن است   بطنش از خوف و دروغ آبستن است

واقعی بات بھی یہی ہے کہ ناتوانی وہ زنِ حاملہ ہے، جس کے بطن سے خوف

اور دروغ، یہ دو توام بچے پیدا ہوتے ہیں۔ ڈرنا اور جھوٹ بولنا ہر کمزور آدمی کی طبیعت ثانیہ ہو جاتا ہے۔

(۵) پس علامہ مسلمانوں کو متنبہ فرماتے ہیں کہ خبردار ناتوانی کے فریب میں مت آنا۔ یہ دشمن مختلف شکلیں بدلتا رہتا ہے مثلاً رحم دلی۔ نرم مزاجی۔ انکسار مجبوری معذوری اور تن آسانی۔

گر خردمندی فریب او مخور | ہمچو حربا ہر زماں رنگش دگر
شکل او اہلِ نظر نشناختند | پردہ ہا بر روئے او انداختند
گاہ او را رحم و نرمی پردہ دار | گاہ می پوشد ردائے انکسار
گاہ او مستور در مجبوری است | گاہ پنہاں در تہِ معذوری است

چہرہ در شکل تن آسانی نمود
دل از دستِ صاحبِ قوّت ربود

(۶) علامہ فرماتے ہیں کہ جس طرح ناتوانی اور باطل کا آپس میں رشتہ ہے اسی طرح طاقت کا صداقت کے ساتھ ایک زبردست تعلق ہے۔ وہ یہ کہ جب دل میں یقین پیدا ہو جاتا ہے تو یہ یقین قوت پیدا کر دیتا ہے۔ اور پھر اس قوت کی بدولت یقین میں (اگرچہ وہ باطل ہی کیوں نہ ہو) شانِ حق پیدا ہو جاتی ہے یعنی قوت ایسی نعمت گراں مایہ ہے کہ اس کی بدولت باطل میں بھی حق کا رنگ جھلکنے لگتا ہے اور وہ اس طرح کہ جب باطل میں قوت پیدا ہو جاتی ہے تو وہ حق کو مٹا کر اپنے آپ

کو حق سمجھنے لگتا ہے لیکن یہ یاد رہے کہ چونکہ باطل کی ذات میں مٹ جانا مضمر ہوتا ہے اس لئے اس کی یہ کامیابی عارضی ہوتی ہے۔ بالآخر حق ہی کی فتح ہوتی ہے۔

با توانائی صداقت توام است گر خود آگاہی ہمیں جامِ جم است
زندگی کشت است و حاصل قوت است شرحِ رمزِ حق و باطل قوت است
مدعی گر مایہ دار از قوت است دعوئ او بے نیازِ حجت است

باطل از قوت پذیرد شانِ حق
خویش را حق داند از بطلانِ حق

(۷) علامہ فرماتے ہیں کہ اپنے اندر قوت اور توانائی پیدا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ہر مسلمان اپنے آپ کو دونوں جہان سے بہتر سمجھے اور خدا کے علاوہ کسی ہستی سے نہ ڈرے۔ اور اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں اسے عطا فرمائی ہیں مثلاً آنکھ، کان اور زبان وغیرہ حواس خمسہ ظاہری نیز حواس خمسہ باطنی اس کا صحیح استعمال کرے تاکہ دنیا اور دین دونوں میں کامیاب ہو سکے۔

اے ز آدابِ امانت بے خبر از دو عالم خویش را بہتر شمر
از رموزِ زندگی آگاہ شو ظالم و جاہل ز غیر اللہ شو

چشم و گوش و لب کشا اے ہوشمند
گر نہ بینی راہ حق بر من بخند

شیدائیانِ علیؒ سے میری درخواست ہے کہ اگر وہ واقعی اپنے آپ کو اُن

کے پیرو سمجھتے ہیں تو پھر اُن کے نقشِ قدم پر بھی چلیں۔ اور جس طرح انہوں نے ساری عمر باطل کا مقابلہ کیا، وہ بھی کریں۔ ورنہ زبان سے حبِّ علیؑ کا دعویٰ اور عمل کے اعتبار سے باطل کی پرستش تو صریحاً منافقت کی نشانی ہے اور یہ راستہ سیدھا دوزخ کو جاتا ہے۔



مبحث ہشتم

اُس نوجوان کا قصّہ جس نے حضرت علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے دشمنوں کے ظلم و ستم کی فریاد کی تھی

اب حضرت علامہ یہ بیان فرماتے ہیں کہ خودی کو استوار اور محکم کرنے کے لئے، تنازع للبقا اور کشمکشِ حیات میں حصّہ لینا ضروری ہے بلکہ دنیاوی مخالفت اور دشمنوں کی عداوت بھی اگر میسّر آجائے تو سونے پر سہاگہ کا کام دے گی چنانچہ اپنے مطلب کی وضاحت کے لئے، اس نوجوان کی حکایت بیان فرماتے ہیں جو مَرو سے حضرت اقدس سیّد علی ہجویری المعروف بہ داتا گنج بخش ؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ ابتدائی چند اشعار حضرت اقدس کی شان میں لکھے ہیں میں تبرکاً اس جگہ درج کئے دیتا ہوں۔

سیّدِ ہجویر مخدومِ امم مرقدِ اُو پیرِ سنجر را حرم

سیّد صاحبؒ امتیوں کے سردار ہیں اور اُن کا مزار مبارک، اس قدر باطنی کشش رکھتا ہے کہ سلطان الہند خواجۂ خواجگاں، مخدومنا و مرشدنا امامنا و سیّدنا و مولٰنا حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری الملقب بہ خواجۂ غریب نوازؒ بھی، روحانی استفادہ کے لئے، سیّد صاحبؒ کے مرقد پر حاضر ہوئے تھے اور چالیسؒ شبانہ روز قیام فرمایا تھا اور وقت رخصت جب دامن گوہر مراد سے بھر لیا تو بے اختیار یہ شعر زبان فیض ترجمان پر جاری ہوگیا تھا۔

گنج بخش فیضِ عالم مظہرِ نورِ خدا
ناقصاں را پیر کامل کاملاں را رہنما

یہ شعر آج بھی حضرتؒ کے گنبدِ مزار پر کندہ ہے اور آپؒ کی عظمت پر شاہد ہے۔

سیّدِ ہجویرؒ مخدومِ اُمم — مرقدِ او پیرِ سنجر را حرم
بندہائے کوہسار آساں گسیخت — در زمینِ ہند تخمِ سجدہ ریخت
عہدِ فاروقؓ از جمالش تازہ شد — حق ز حرفِ او بلند آوازہ شد
پاسبانِ عزتِ اُمّ الکتاب — از نگاہش خانۂ باطل خراب

خاکِ پنجاب از دمِ او زندہ گشت
صبحِ ما از مہرِ او تابندہ گشت

ایک دن، ایک نوجوان شہر مرو (ترکستان) سے آپؒ کی خدمت میں حاضر

ہوا اور عرض کی کہ حضور! میں دشمنوں میں محصور ہوں۔

بامن آموز اے شہِ گردوں مکاں　　زندگی کردن میانِ دشمناں

یہ سُن کر حضرتؒ نے فرمایا۔

فارغ از اندیشۂ اغیار شو　　قوّتِ خوابیدۂ بیدار شو

تو اغیار کے اندیشہ سے فارغ ہو جا۔ تو قوّتِ خوابیدہ ہے، بیدار ہو جا۔

سنگ چوں بر خود گمانِ شیشہ کرد　　شیشہ گردید و شکستن پیشہ کرد

اگر پتھر اپنے متعلق یہ گمان کرے کہ میں تو شیشہ ہوں، تو رفتہ رفتہ شیشہ ہی بن جائے گا اور ہر شخص اُسے توڑ سکے گا۔

ناتواں خود را اگر رہرو شمرد　　نقدِ جانِ خویش با رہزن سپرد

اگر رہرو اپنے آپ کو کمزور سمجھتا ہے تو یقیناً راستہ میں لُٹ جائے گا۔

تا کجا خود را شماری ماء و طین　　از گِلِ خود شعلۂ طور آفریں

(اے مردِ مسلماں) تو کب تک اپنے آپ کو مٹی اور پانی سے مرکب تصوّر کرے گا؟ تجھے لازم ہے کہ اپنی شخصیت (خودی) کو اتنا بلند کرے کہ اس سے شعلۂ طور پیدا ہو۔

باعزیزاں سرگراں بودن چرا
شکوہ سنجِ دشمناں بودن چرا

رشتہ داروں کا گلہ بے سود ہے اور دشمنوں کی شکایت بالکل بے فائدہ ہے۔

راست می گویم عدو از یارِ تست — هستی او رونقِ بازارِ تست

(اے مسلماں) میں تجھ سے سچ کہتا ہوں کہ عدو بھی تیرا دوست ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ اس کے دم سے تیری زندگی میں ہنگامہ اور سرگرمی پائی جاتی ہے۔

ہر کہ دانائے مقاماتِ خودی است — فضلِ حق داند اگر دشمن قوی است

جو شخص خودی کے مقامات سے آگاہ ہے وہ تو اس بات کو خدا کی مہربانی تصور کرتا ہے اگر اُسے کسی زبردست دشمن سے سابقہ پڑ جائے کیونکہ اسے اپنی مخفی قوتوں کو بروئے کار لانے کا موقع ملے گا۔

کشتِ انساں را عدو باشد سحاب — ممکناتش را برانگیزد ز خواب

انسان کی زندگی کی کھیتی کے لئے، دشمن، بادل کا کام دیتا ہے اور انسان کی مخفی یا خوابیدہ قوتوں کے بیدار ہونے کا موجب بنتا ہے۔

سنگِ رہ آب است اگر ہمت قوی است — سیل را پست و بلندِ جادہ چیست

فرماتے ہیں کہ اگر انسان کی ہمت بلند ہو تو راستہ کا پتھر، پانی کی طرح ہو جاتا ہے۔ یقین نہ ہو تو دیکھ لو جس وقت سیلاب آتا ہے، اس کے سامنے پستی اور بلندی دونوں یکساں ہوتی ہیں، وہ تو بڑے بڑے درخت جڑ سے اکھاڑ دیتا ہے اور تنکے کی طرح ساتھ بہالے جاتا ہے۔

مثلِ حیواں خوردن آسودن چہ سود — گر بخود محکم نۂ بودن چہ سود ؟

بھلا انسان کو، حیوانوں کی طرح زندگی بسر کرنے سے کیا فائدہ حاصل ہو سکتا

ہے؟ کھانا اور سونا یہ تو حیوانوں کی زندگی ہے نہ کہ انسانوں کی۔ فرماتے ہیں کہ جس انسان کی خودی محکم اور مستحکم، استوار اور پائیدار نہ ہو اس کا جینا بالکل اکارت ہے اور ہونا نہ ہونا دونوں برابر ہیں۔

۷۔ خویش را چوں از خودی محکم کنی — تو اگر خواہی جہاں برہم کنی

اگر تو اپنی خودی کو مضبوط کرے تو اگر چاہے تو اس جہاں کو درہم برہم کر سکتا ہے جس طرح سکندر، علی مرتضیٰؓ، خالدؓ، محمدؒ ابن قاسمؒ، محمود غزنوی، سلطان محمد فاتح، نپولین اور مصطفےٰ کمال نے سچ مچ کر دکھایا۔

گر فنا خواہی ز خود آزاد شو — گر بقا خواہی بخود آباد شو

فرماتے ہیں کہ اے مسلمان اگر تو فنا کا آرزومند ہے تو اپنی خودی کی حفاظت اور تربیت سے غافل ہو جا۔ اور اگر بقاء کا طالب ہے تو اپنی خودی کو آباد کر یعنی اسے مستحکم کر، اُسے مضبوط کر۔

۸۔ چیست مردن؟ از خودی غافل شدن — تو چہ پنداری فراقِ جان و تن

سبحان اللہ! کیا نکتۂ بلیغ ارشاد فرمایا ہے۔

موت دراصل، خودی کی حفاظت اور تربیت سے غافل ہو جانے کا نام ہے نہ کہ روح کے جسم سے جدا ہونے کا۔

علامہ کی نظر میں جو مسلمان اپنی خودی کی تربیت سے غافل ہے، بالکل مُردہ ہے گو بظاہر وہ کتنا ہی تن و توش کیوں نہ رکھتا ہو اور کتنا ہی دولت مند کیوں نہ ہو۔

در خودی کن صورتِ یوسفؑ مقام　　　　از اسیری تا شہنشاہی خرام

اگر تُو بھی حضرت یوسفؑ کی طرح اپنی خودی کو مستحکم کرے، تو اسیری کی حالت سے، بادشاہت کے رتبہ کو پہنچ سکتا ہے۔

ایک پرندے کی کہانی جو پیاس سے بیتاب تھا

اس کے بعد علّامہ نے ایک طائر کی مثال دی ہے کہ وُہ پیاس سے بیتاب تھا، اور اس نے غلطی سے ریزۂ الماس کو پانی کی بوند سمجھا، لیکن

مایۂ اندوزِ نم از گوہر نہ شد　　　　زو بر و منقار و کامش تر نہ شد

الماس نے یہ صورت حال دیکھ کر طائر سے کہا کہ مَیں قطرۂ آب نہیں ہوں ریزۂ الماس ہوں، مجھے پانی مت سمجھ، مَیں تو وہ طاقت رکھتا ہوں کہ تیری چونچ توڑ دوں بلکہ تُو تو کیا چیز ہے اگر انسان مجھے چبانا چاہے تو اُسے بھی اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑیں گے اور مجھے یہ طاقت اس لئے حاصل ہوئی کہ مَیں نے اپنی خودی کو مستحکم بنا لیا ہے، میں قطرۂ آب کی طرح رقیق اور کمزور نہیں ہوں۔

یہ سُنکر طائر بیچارہ پانی کی تلاش میں، ایک باغ کی طرف جا نکلا، وہاں اس نے

ایک پتہ پر قطرۂ شبنم دیکھا تو اپنی پیاس بجھائی۔ اب علامہ مسلمان سے دریافت فرماتے ہیں۔

ایکہ می خواہی ز دشمن جاں بری ۔۔۔ از تو پرسم قطرۂ یا گوہری

اے مسلماں! تو جو کہ دشمن ذاتی یا قومی پر غالب آنا چاہتا ہے میں تجھ سے پوچھتا ہوں کہ تو قطرہ ہے یا گوہر۔

اگر تو قطرہ ہے تو کبھی سلامت نہیں رہ سکتا، کسی کی پیاس بجھانے کے کام آجائے گا۔ زندگی تو حق اسی کا ہے جو الماس کی طرح سخت ہو۔

غافل از حفظِ خودی یک دم مشو ۔۔۔ ریزۂ الماس شو شبنم مشو

الماس اور کوئلے کا قصّہ

چونکہ خودی کی حفاظت اور تربیت، علامہؒ کے فلسفۂ خودی کا سنگِ بُنیاد ہے اس لئے انہوں نے اپنے مافی الضمیر کو مسلمان کے ذہن نشین کرنے کے لئے صرف ایک ہی مثال پر اکتفا نہیں کیا بلکہ الماس و زغال کی حکایت بھی بیان کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ

"کوئلہ نے الماس سے کہا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ اگرچہ اصلیت کے لحاظ

سے ہم دونوں میں کوئی فرق نہیں، کوئلہ اور الماس کی کیمیاوی تحلیل کی جائے
دونوں کے عناصر ترکیبی یکساں نظر آتے ہیں، لیکن تو بادشاہوں کے تاج میں
ہتا ہے اور میں بھٹی میں جلتا ہوں؟

الماس نے جواب دیا مجھ میں پختگی سختی اور صلابت ہے اور یہی خاصہ میری
یم اور عظمت کا سبب ہے اصل کے لحاظ سے، تو بلاشبہ ہم دونوں ایک ہی
ہیں، مجھے تجھ پر کوئی تفوق حاصل نہیں ہے لیکن میں نے اپنی خودی کو مستحکم کیا حتیٰ کہ
بن سنگ بن گیا اور اسی سے اس رتبہ کو پہنچا کہ "نور دیدۂ قیصر اور زیب دستۂ خنجر"
ہوں۔ چونکہ تو نے اپنی خودی کو مستحکم نہیں کیا، اور تیرے اندر کمزوری تھی اس لئے
تجھے بھٹی میں جلنا پڑا۔ اگر تو اس مصیبت اور ذلت سے نجات چاہتا ہے تو نرمی
چھوڑ دے، سختی اختیار کر۔

می شود از وے دو عالم مستنیر
ہر کہ باشد سخت کوش و سخت گیر

جو شخص جفاکش پُردم اور صاحب عزم ہوتا ہے، دونوں عالم اس کے وجود
سے فیض حاصل کرتے ہیں۔

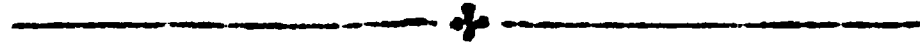
مشتِ خاکے اصلِ سنگ اسود است کو سر از جیب حرم بیروں زد است

رتبہ اش از طور بالاتر شد است

بوسہ گاہِ اسود و احمر شد است

دیکھو، سنگ اسود، چونکہ سنگ ہے، اس لئے اس کا رتبہ کوہ طور سے
بھی بڑھا ہوا ہے اور تمام دنیا کے مسلمان اسے بوسہ دیتے ہیں۔

در صلابت آبروئے زندگی است
ناتوانی ناکسی ناپختگی است



مبحث نہم

شیخ و برہمن کا قصّہ اور گنگا و ہمالہ کا مکالمہ اس بارے میں کہ قومی زندگی کا تسلسل قومی خصوصیات و روایات کی سخت پابندی پر منحصر ہے

اپنی خودی کو مستحکم کرنے کے بعد، انسان کا فرض یہ ہے کہ اپنے اندر شانِ اجتماعیت پیدا کرے اور اس کی صورت یہ ہے کہ اپنی ملّی روایات کو محفوظ رکھے اور ان پر سختی کے ساتھ عمل کرے۔ اس بات کو علّامہ نے شیخ و برہمن کے مکالمہ سے واضح کیا ہے کہ بنارس میں ایک برہمن تھا جس نے بڑی ریاضت کی تھی، مگر اُسے گوہرِ مقصود ہاتھ نہ آیا، مجبوراً ایک درویش کی خدمت میں حاضر ہو کر ماجرا عرض کیا، اُس مردِ کامل نے کہا۔

گفت شیخ اے طائفِ چرخِ بلند   اند کے عہدِ وفا با خاک بند

با زمین در ساز اے گردوں نورد　　در تلاشِ گوہرِ انجم مگرد

یعنی، تُو مابعدالطبیعاتی مسائل میں الجھا ہُوا ہے اور یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ خدا کیا ہے؟ انسان کی اصل کیا ہے؟ کائنات کس طرح موجود ہوئی؟ لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ تُو سب سے پہلے اپنی خودی کو مستحکم کرے، اگر کسی انسان کو اپنی خودی سے آگاہی حاصل نہ ہو، یا اگر اس کی خودی مستحکم نہ ہو تو فلسفہ، منطق اور حکمت کوئی چیز اُسے فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔

من نہ گویم از بتاں بیزار شو　　کافری! شائستۂ زنّار شو

مَیں تجھ سے یہ نہیں کہتا کہ بُت پرستی ترک کرے۔ ہاں اس قدر کہتا ہوں کہ اگر تُو کافری اختیار کرتا ہے تو، اس میں ایسا کمال پیدا کر کہ شایانِ زنّار ہو جائے۔

اے امانت دارِ تہذیبِ کہن　　پشت پا بر مسلکِ آبا مزن

اے تہذیبِ قدیم کے وارث! اپنے بزرگوں کے مسلک سے انحراف نہ کر۔ کیوں؟

گر ز جمعیت حیاتِ ملّت است　　کفر ہم سرمایۂ جمعیت است

اس لئے کہ حیاتِ ملّی جمعیت (اجتماعیت) پر منحصر ہے تو کفر بھی تو سرمایۂ جمعیت ہے یعنی اس کی بدولت بھی شانِ اجتماعیت پیدا ہو سکتی ہے مگر

تو کہ ہم در کافری کامل نہٴ　　در خورِ طوفِ حریمِ دل نہٴ

بات یہ ہے کہ تو کافری میں بھی تو کامل نہیں ہے اس لئے حریمِ دل کا طواف

نہیں کر سکتا یعنی رازہائے کائنات تجھ پر منکشف نہیں ہو سکتے۔

دور تو ز آذر من ز ابراہیم دور
ماندہ ایم از جادۂ تسلیم دور

در جنونِ عاشقی کامل نشد
قیسِ ما سودائیِ محمل نشد

مُرد چوں شمعِ خودی اندر وجود
از خیالِ آسماں پیما چہ سود؟

یعنی جس انسان کی خودی مُردہ ہو، اُسے فلسفہ اور منطق سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ اور ہمارے نوجوانوں کی، جو آج، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھ رہے ہیں، بعینہٖ یہی حالت ہے، ان کی خودی فنا ہو چکی ہے روایاتِ ملّیہ سے وہ یکسر بیگانہ ہیں، کوئی نصب العین اُن کے سامنے نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کا علم انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ وہ یہ تو جانتے ہیں کہ براؤننگ کا فلسفہ کیا ہے مگر یہ خبر نہیں کہ اُن کے آقا محمدؐ مصطفےٰ روحی لہ الفداء کا ارشاد کیا ہے، انہیں یہ تو معلوم ہے کہ ہیگل اور برگساں نے کیا کہا لیکن یہ علم نہیں کہ قرآن اور حدیث میں کیا لکھا ہے؟ وہ آرٹ اور اسی قبیل کی چیزوں پر مکالمے لکھ سکتے ہیں لیکن اعلائے کلمۃ اللہ کے جذبہ سے ان کا دل یکسر خالی ہے۔ وُہ شائد بُت پرستی کی تردید میں ایک آدھ عقلی دلیل بھی لا سکیں لیکن خود اُن کے دماغوں میں جو "بُت خانہ" آباد ہے، اُسے خارج نہیں کر سکتے۔ وہ موٹر اور کوٹھی کا خواب تو دیکھ سکتے ہیں لیکن حریت اور آزادی کا تصور اُن کے دماغ میں پیدا نہیں ہو سکتا۔

اس کی وجہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ اُن کی خودی یعنی دِل مُردہ ہو چکا

ہے اندریں حالات تزئین دماغ مطلق فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ اسی لئے علامہؒ نے اپنی وفات سے چند ماہ پہلے، ہندوستان کے باشندوں سے ان الفاظ میں خطاب فرمایا۔

پیامے دہ ز من ہندوستاں را
غلام، آزاد از بیداریٔ دل

اس کے بعد علامہؒ نے ہمالہ اور گنگ کا مکالمہ بیان فرمایا ہے۔ ایک دن گنگا نے ہمالیہ سے کہا کہ بے شک تو بہت بلند ہے، اس قدر کہ آسماں سے باتیں کر رہا ہے لیکن جب تیرے اندر طاقت رفتار نہیں تو یہ رفعت اور تمکین کس کام کی جب ہمالیہ نے یہ طعنہ سنا، تو کہا۔

ایں خرامِ ناز سامانِ فنا است — ہر کہ از خود رفت شایانِ فنا ست
از مقامِ خود نداری آگہی — بر زیانِ خویش نازی، ابلہی

ان شعروں میں ایک منطقی قضیہ بیان کیا گیا ہے۔

صغریٰ:۔
جو اپنی خودی کو منضبط اور مستحکم نہ کر سکے وہ شایانِ فنا ہے

کبریٰ:۔
دا ے گنگا، تو بوجہ خرامِ ناز اپنی خودی کی حفاظت سے قاصر ہے۔

نتیجہ:۔ پس تو صفت بقا سے محروم ہے افسوس تو اپنے مقام

سے آگاہ نہیں ہے اور اسی لئے اپنے نقصان پر نازاں ہے۔

کبریٰ میں جو دعویٰ ہے اس پر دلیل ملاحظہ ہو۔

ہستیِ خود نذرِ قلزم ساختی پیشِ رہزن نقدِ جاں انداختی

تُو (گنگا) اپنی ہستی (خودی) سمندر (خلیج بنگالہ) کی نذر کر دیتی ہے! اور اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ تیری، اپنی ہستی کچھ نہیں، تیرا اپنا مستقل وجود کچھ نہیں، تُو اُس رہرو کی طرح ہے جسے راستہ میں، کوئی رہزن لُوٹ لے۔

اِس کے بعد ہمالہ اُسے زندگی کا مفہوم سمجھاتا ہے۔

زندگی بر جائے خود بالیدن است از خیابانِ خودی گُل چیدن است



مبحث دھم

مُسلمان کا مقصدِ حیات اعلائے کلمۃ اللہ ہے اور اگر جہاد سے غرض و غائت تسخیر ممالک ہو تو وہ اسلام میں حرام ہے

یہ مبحث بہت اہم ہے اور تقاضائے عصرِ حاضر کے عین مطابق ہے۔ کاش!
ہندی مسلمان ان دونوں سے آشنا ہو سکیں ؎

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

سوال یہ ہے کہ جب انسان کی خودی مضبوط ہو گئی تو اب وُہ کیا کرے؟
اس مبحث میں اسی کا جواب دیا گیا ہے۔

مسلمان کو لازم ہے کہ اپنے قلب پر خدائی کا رنگ چڑھائے اور جب وُہ مسلمان ہو جائے، اور یہی ضروری چیز ہے تو پھر مسلمان عشق کی دنیا میں نام پیدا کر سکتا ہے۔

خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل؟
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

اور دل کا مسلمان ہو جانا، اس کا زندہ ہو جانا ہے۔

دلِ بیدار فاروقی دلِ بیدار کراری ۔۔۔ مسِ آدم کے حق میں کیمیا ہے دل کی بیداری

طبعِ مسلم از محبت قاہر است ۔۔۔ مسلم ار عاشق نباشد کافر است

کفر اور اسلام میں مابہ الامتیاز کیا ہے؟

عشق!

کافر اور مسلم میں ذریعۂ امتیاز کیا ہے؟

عشق!

مسلم کون ہے؟

جو عاشق ہو!

کس کا؟

محمد مصطفےٰ کا!

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَ بَارِکْ وَسَلِّمْ

آنحضرتؐ سے عشق کیونکر کیا جائے؟

قرآن مجید کی اتباع سے!

قرآن مجید کا پیغام کیا ہے؟ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ!

اس کا مطلب کیا ہے؟ سنئے۔

ماسوا اللہ را مسلمان بندہ نیست   پیشِ فرعونے سرش افگندہ نیست

یعنی قرآن کا خلاصہ دو لفظوں میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے۔

(۱) اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں اور چونکہ حقیقت یہ ہے اس لئے مسلمان کسی کا غلام نہیں ہو سکتا۔

پھر پڑھئے اس شعر کو۔

طبعِ مسلم از محبت قاہر است   مسلم ار عاشق نباشد کافر است

یعنی مسلمان محبت کی مدد سے، دوسروں پر غالب آتا ہے اس کے غلبہ میں ظلم و ستم کا عنصر نہیں ہوتا۔ وہ سراپا محبت ہوتا ہے، یعنی غالب آنا تو مسلمان کا خاصہ ہے، قہاری (حکومت، سروری) تو اجزائے ترکیبی میں داخل ہے لیکن وہ جبر و تعدی سے نہیں بلکہ عشق و محبت سے غلبہ حاصل کرتا ہے، اور جو مسلمان، عاشق نہیں وہ مسلمان نہیں بلکہ کافر ہے۔

تابع حق دیدنش نادیدنش   خوردنش نوشیدنش خوابیدنش

مسلمان وہ ہے جس کی زندگی خدا تعالیٰ کے زیرِ فرمان ہو، نہ کہ نفس امّارہ کے اور اس کا دیکھنا یا نہ دیکھنا، کھانا پینا، سونا اور چلنا پھرنا سب اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق ہو۔ اس شعر میں علامہؒ نے قرآن مجید کی اس آیت کو نظم کر دیا۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ

الْعٰلَمِيْنَ۔

(اے رسولؐ انسانوں کو مطلع فرما دیجئے کہ) میری نماز اور میری قربانی، میرا مرنا اور جینا سب اس اللہ کے لئے ہے جو تمام جہانوں کا خالق اور مالک ہے۔"

در رضائش مرضیٔ حق گم شود　　این سخن کے باور مردم شود

جو شخص اپنی زندگی کو تابع، فرمان الٰہی بنا دیتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اُسے ایسا بلند مقام عطا فرما دیتا ہے جس کی بلندی کا اندازہ بھی عام لوگ نہیں کر سکتے یعنی اس کی مرضی خدا کی مرضی، ہو جاتی ہے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اس شعر کی شرح میں ایک مستقل کتاب لکھی جا سکتی ہے لیکن بخوفِ طوالت صرف چند سطور پر اکتفا کرتا ہوں:۔

(۱) بندۂ مومن کی مرضی (رضا) خدا کی مرضی (مشیئت) کس طرح ہو سکتی ہے؟ بربنائے اتحاد۔

(۲) اتحاد کیسے ممکن ہے؟ اس طرح کہ بندہ پہلے خدا کے رنگ میں اپنے دل کو غوطہ دے اور اس پر خدا کا رنگ چڑھالے۔

"وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً"؟

(۳) عالم مادی میں اس کی مثال مل سکتی ہے؟ ہاں جب پارۂ فولاد اپنی

فولادی کو، آتش گلخن کے تابع، بنا دیتا ہے یعنی اپنے قلب پر، آگ کا رنگ چڑھا دیتا ہے تو، اس کے اندر آگ ہی کی صفات پیدا ہو جاتی ہیں اس کا رنگ سُرخ ہو جاتا ہے اور وُہ بھی وہی کام کرتا ہے جو آگ کرتی ہے یعنی جلانا۔

"وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ"۔

(۴) کیا اتحاد، کے معنی یہ ہیں کہ عبد اور معبود (عاشق اور معشوق) دونوں ایک ہو جائیں بایں معنی کہ دوئی یا مغائرت مٹ جائے؟ نہیں۔ میں نے اس جگہ اتحادُ بو انجذاب یا حلول یا غیبت کے معنی میں استعمال نہیں کیا بلکہ بایں معنی استعمال کیا ہے کہ دونوں کی انفرادیت علیٰ حالہٖ قائم رہتی ہے ٹھیک اسی طرح، فولاد کا ٹکڑا آگ ہو جانے پر بھی فولاد ہی رہتا ہے مبصّر جانتا ہے کہ یہ انگارہ نہیں ہے بلکہ فولاد ہے۔ علامہؒ باتباع قرآن کسی غیر عقیدہ کے قائل نہیں ہو سکتے۔ وصل واتحاد، اصطلاحی معنیٰ میں، قرآنی نصوص کے خلاف ہے۔ عبد، عبدہٗ ہو کر بھی عبد ہی رہتا ہے، معبود نہیں ہو سکتا۔ اور جنہوں نے جاوید نامہ پڑھا ہے وہ جانتے ہیں کہ عبد اور عبدہٗ میں کیا فرق ہے:۔

عبد دیگر عبدہٗ چیزے دگر
ما سراپا انتظار او منتظر

علامہؒ کی یہ تعلیم قرآن مجید کے عین مطابق ہے:۔

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَلَا

يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا -

یعنی جسے اپنے رب سے ملاقات کی آرزو ہو، اُسے لازم ہے کہ وہ نیک عمل کرے اور اس کی صورت یہ ہے کہ شرک سے مجتنب رہے کیونکہ مشرک کا عمل، عمل صالح نہیں بن سکتا ہے جس طرح، اگر کسی برتن میں گائے یا بکری کے پیشاب کی چند بوندیں پڑی ہوں۔ اور اس میں اسی کے دودھ کی کھیر پکائی جائے تو کوئی متقی اور پاکیزہ طبع انسان اُسے کھانا پسند نہ کرے گا۔

اب دیکھ لیجئے اس آیت میں مسلمان کا نصب العین لقآء ربّ کو قرار دیا گیا ہے اور ملاقات کے لئے مغائرت لازمی ہے کیونکہ ملاقات دو یا زیادہ افراد کے مابین ہوتی ہے۔

خیمہ در میدانِ الّا اللہ زدست　　در جہاں شاہد علی الناس آمدست

مسلمان وُہ ہے جو خیمۂ توحید میں رہتا ہو اور انسانوں پر شاہد ہو۔

شاہدِ حالش نبیؐ انس و جاں　　شاہدے صادق ترینِ شاہداں

اور نبی کریم صلعم اس کے حال پہ شاہد ہوں اور آنحضرتؐ سے بڑھ کر، دُنیا میں کون شاہد ہو سکتا ہے؟

اب یہاں سے رنگِ کلام بدلتا ہے۔ مومن کی تعریف بیان کرنے کے بعد اب مسلمان سے خطاب فرماتے ہیں۔

قال را بگزار و بابِ حال زن　　نورِ حق بر ظلمتِ اعمال زن

اے مسلمان! زبانی جمع خرچ سے باز آ کر عمل کا سلسلہ شروع کر اور اپنے اعمال کی ظلمت کو، اللہ کے نور کی مدد سے دُور کر۔

قربِ حق از ہر عمل مقصود دار   تا ز تو گردد جلالش آشکار

اور اپنے اعمال کا مقصود قربِ حق کو قرار دے۔ یعنی تقرب الٰہی کو اپنے اعمال کی کسوٹی بنا۔ جو فعل یا عمل تجھے خدا سے قریب کرے وہ اچھا ہے اور جو فعل یا عمل تجھے خدا سے دور کرے وہ بُرا ہے خواہ روسو، مارکس، لینن اور نہرو چاروں کے چاروں اسے اچھا کیوں نہ کہیں۔

صلح، شر گردد چو مقصود ست غیر   گر خدا باشد غرض، جنگ است خیر

اگر صلح میں تیری ذاتی غرض پوشیدہ ہو تو وہ صلح بھی شر ہے اور اگر ذاتی غرض پیش نظر نہیں بلکہ اعلائے کلمۃ اللہ کا جنون ہے تو جنگ و جدل سراپا خیر و برکت ہے بلکہ موجب فلاح دارین ہے۔

گر نہ گردد حق ز تیغ ما بلند   جنگ باشد قوم را نا ارجمند

اگر ہماری تلوار، حق کی حمایت میں بلند نہ ہو بلکہ جوع الارض کے لئے ہو تو ایسی جنگ قوم کے لئے موجب مضرت ہے۔

علامہؒ نے ان دو شعروں میں، اسلامی جہاد کا پورا فلسفہ بیان کر دیا ہے۔

رموزِ بے خودی میں فرماتے ہیں۔

تیغ بہرِ عزت دین است و بس   مقصدِ او، حفظِ آئین است و بس

یعنی مسلمان صرف ایک صورت میں تلوار اٹھا سکتا ہے۔ وہ کیا ہے؟ حفاظت مذہب یعنی حفاظتِ آئین اسلام، کیوں؟ اس لئے کہ مسلمان کا مقصدِ حیات یہ ہے کہ حکومتِ الٰہیہ دُنیا میں قائم ہو، اور اس حکومت کا آئین یا دستور العمل نہ رومن لا ہے نہ کوڈ نپولین نہ تورہ چنگیزی نہ آئین اکبری نہ سوشلس کوڈ بلکہ قرآن حکیم ہے۔

آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم حکمتِ او لایزال است و قدیم

چونکہ دین میں جبر نہیں بفحوائے "لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ" اس لئے کوئی مسلمان کسی غیر مسلم کو تلوار کے زور سے مسلمان نہیں بنا سکتا۔ وہ صرف قرآن اور خدائے قرآن اور حامل قرآن کی حمایت میں تلوار بلند کر سکتا ہے اسی کو جہاد فی سبیل اللہ کہتے ہیں۔ جوع الارض، اور دوسروں کو غلام بنانا، یا دوسروں کو ستانا یہ تینوں باتیں اسلامی تعلیمات کی روح کے خلاف ہیں۔

اس کے بعد علامہؒ نے حضرت میاں میرؒ کی تعلیم سے اپنے مضمون کو واضح فرمایا ہے

حضرتِ شیخ میاں میرؒ ولی ہر خفی از نورِ جانِ او جلی
بر طریقِ مصطفےٰ محکم پئے نغمۂ عشق و محبت را نئے
تربتش ایمانِ خاکِ ما مشعلِ نورِ ہدایت بہرِ ما
بر درِ او جبہ فرسا آسماں از مریدانش شہِ ہندوستاں

شہِ ہندوستان سے مراد شاہ جہاں ہے، جو مثل دیگر افغان اور ترک شاہان

ہندوستان کے باستثناء معدودے چند ایک دُنیا دار ٹائپ کا مسلمان بادشاہ تھا۔

شاہ تخمِ حرص در دِل کاشتے　　قصدِ تسخیرِ ممالک داشتے

چنانچہ ایک دن، اس فانی دنیا کی طلب میں حضرت میاں میرؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور حرفِ مطلب زبان پہ لایا۔ حضرتؒ نے مدعا سُن کر توقف فرمایا، کچھ جواب نہ دیا۔ اسی اثنا میں ایک مرید کچھ چاندی کے سکے لے کر حاضر ہوا اور حضرتؒ کے قدموں میں رکھ کر کہنے لگا "میں نے کئی روز کی مسلسل محنت مزدوری سے یہ رقم حاصل کی ہے اَور میں اسے آپ کی نذر کرتا ہوں" اس کا جو جواب شیخ نے دیا وہ لائقِ شنید ہے۔

گفت شیخ، ایں زر حقِ سلطانِ ماست　　آنکہ در پیراہنِ شاہی گداست

حکمرانِ مہر و ماہ و انجم است　　شاہِ ما مفلس ترینِ مردم است

دیدہ بر خوانِ اجانب دوختست　　آتشِ جوعش جہانے سوختست

قحط و طاعون تابعِ شمشیرِ او　　عالمے ویرانہ از تعمیرِ او

از خیالِ خود فریب و فکرِ خام　　می کند تا راج را تسخیر نام

اسی خیال کو جاوید نامے میں یوں بیان فرمایا ہے۔

جنگِ شاہانِ جہاں غارت گری است

جنگِ مومن سُنّتِ پیغمبری است

یعنی دنیا طلب بادشاہ دراصل، ارضِ خدا کو تاراج کرتے ہیں لیکن اپنی حماقت کی وجہ سے اسے تسخیر سمجھتے ہیں۔

آتشِ جانِ گدا، جوعِ گداست　　جوعِ سلطاں ملک و ملت را فناست

اگر درویش کو بھوک کا عارضہ ہو جائے اور یہ نہایت مذموم بات ہے کیونکہ کم خوری، درویشی کی صفتِ اولیں ہے بسیار خور کبھی عارف نہیں ہو سکتا جیسا کہ سعدیؒ نے لکھا ہے۔

اندروں از طعام خالی دار
تا درآں نورِ معرفت بینی

تو صرف ایک فرد کی جان کا نقصان ہے یعنی صرف وہ درویش فنا ہو جائیگا۔ لیکن سلطان اگر جوع الارض میں مبتلا ہو جائے (جس طرح برطانیہ، فرانس، جرمن، جاپان اور اٹلی آج کل مبتلا ہیں) تو سارا ملک تباہ ہو جائے گا۔

ہر کہ خنجر بہرِ غیر اللہ کشید
تیغِ او در سینۂ او آرمید

مبحث یازدہم

الوقت سیف

یعنی بحث زمان و مکان

علامہ اقبالؒ نے اس عنوان کے ذیل میں زمان و مکان کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ پہلے میرا ارادہ تھا کہ میں اس ضمن میں اس بحث کو بھی لکھ دوں جو علامہؒ نے اپنے خطبات مدراس میں پیش کی ہے اور پروفیسر الیگزینڈر، برگساں اور دیگر مغربی فلاسفہ کے افکار کی طرف بھی اشارہ کر دوں لیکن غور کرنے سے یہ معلوم ہوا کہ اگر اس اسلوب کو اختیار کیا تو بحث بہت طویل اور بہت دقیق ہو جائے گی۔ اس لئے میں سر دست صرف مثنوی کے اشعار کی تشریح پر اکتفا کرتا ہوں۔ زمان و مکان کی مفصل بحث اگر کوئی صاحب دیکھنا چاہیں تو جناب پروفیسر رضی الدین صاحب صدیقی ایم، اے، پی۔ ایچ، ڈی کی کتاب اقبال کا تصور زمان و مکان

ملاحظہ فرمائیں۔ پروفیسر رضی الدین صاحب صدیقی جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کے ریاضی کے استاذ الاساتذہ ہیں اور دو سال ہوئے آپ نے ریاضی میں ایک لاکھ روپے کا "نوبل پرائز" حاصل کیا تھا۔ آپ ریاضی میں بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں اور اسلام کے مایۂ ناز فرزند۔ حق یہ ہے کہ اس بحث پر گفتگو کرنا آپ ہی کا حق تھا۔

سبز بادا خاکِ پاکِ شافعیؒ عالمے سرخوش ز تاکِ شافعیؒ

فکر او کوکب ز گردوں چیدہ است سیفِ بُرّاں وقت را نامیدہ است

یعنی خدا تعالیٰ امام شافعیؒ کو مراتب عالیہ نصیب کرے! انہوں نے کیسی عُمدہ بات کہی ہے کہ "اَلْوَقْتُ سَیْفٌ" یعنی وقت تلوار ہے۔

حضرت امام شافعیؒ فقہ اسلامی کے چار اماموں میں سے ایک امام ہیں انہوں نے یہ مقولہ کہ "وقت تلوار ہے" غالباً اس حقیقت کے اظہار کے لئے استعمال کیا تھا کہ وقت حوادث روزگار کو ایک دوسرے سے جدا کر دیتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ علامہؒ نے جو معانی اُن کے مقولہ کو پہنائے ہیں وہ ان کے نہاں خانۂ دماغ میں بھی ہو تو ہوں۔ خواہ کچھ ہی ہو علامہؒ کو اُن کا یہ مقولہ بہت پسند آیا اسی لئے انہوں نے اسے موضوعِ بحث بنایا۔

من چہ گویم سِرّ ایں شمشیر چیست آب او سرمایہ دارِ زندگیست

علامہؒ فرماتے ہیں کہ وقت کی حقیقت لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتی۔ یوں سمجھ لیجیے کہ اس تلوار کی دھار حیات پر منحصر ہے یعنی اگر حیات نہ ہو تو وقت کا وجود بھی نہ ہو۔

اب علامہؒ یہ بیان فرماتے ہیں کہ صاحبِ وقت کی صفات کیا ہوتی ہیں:۔

صاحبش بالاتر از امید و بیم   دست او بیضا تر از دستِ کلیم

جو شخص زمان پر حکمران ہو وہ امید و بیم سے بالاتر ہوتا ہے، اور اسے غیر معمولی بلکہ فوق البشر قوتیں حاصل ہوتی ہیں۔

در کفِ موسیٰؑ ہمیں شمشیر بود   کار او بالاتر از تدبیر بود

سینۂ دریائے احمر چاک کرد   قلزمے را خشک مثلِ خاک کرد

پنجۂ حیدرؓ کہ خیبر گیر بود   قوتِ او از ہمیں شمشیر بود

حضرت موسیٰؑ نے جو بحر قلزم کو خشک کر دیا اور حضرت علیؓ نے جو خیبر کا دروازہ ایک ہاتھ سے اکھیڑ پھینکا تو محض اس لیے تھا کہ یہ دونوں حضرات زمان پر حکمران تھے [1]

---

[1] علامہ اقبالؒ نے علم کلام میں کیا خدمت انجام دی، اور متکلمین کے زمرہ میں ان کا پایہ کیا ہے؟ یہ بحث میرے موضوع سے خارج ہے مگر صرف اس قدر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس دورِ مادیت میں معجزات کا عقلی امکان ثابت کر کے، علامہؒ نے مذہب کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔ اگر سرسید مرحوم کی توجہ اس طرف مبذول ہو جاتی تو انہیں معجزاتِ انبیاء کی تاویلاتِ رکیکہ کی ضرورت پیش نہ آتی بلکہ وہ یہ کہہ کر ان کا ثبوت دے سکتے تھے کہ جو شخص زمان پر حکمران ہو جاتا ہے اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ:۔

پنجۂ او پنجۂ حق می شود   ماہ از انگشت او شق می شود (اقبالؒ)

گردشِ گردونِ گرداں بیدنی است　　انقلابِ روز و شب فہمیدنی است

قرآن مجید نے انقلاب روز و شب کو اللہ کی سب سے بڑی نشانیوں میں قرار دیا ہے۔

اس لئے علامہؒ فرماتے ہیں کہ گردش افلاک اور انقلاب روز و شب پر غور کرو لیکن انسان بعض وجوہ کی بنا پر اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا کہ زمانہ بھی کوئی خارجی وجود رکھتا ہے۔ چنانچہ علامہؒ اس غلط خیال کی تردید فرماتے ہیں۔

اے اسیرِ دوش و فردا در نگر　　در دلِ خود عالمِ دیگر نگر

در گِلِ خود تخمِ ظلمت کاشتی　　وقت را مثلِ خطے پنداشتی

یعنی اے اسیر دوش و فردا! اے وہ شخص جو اپنے آپ کو زمانہ کا محکوم سمجھتا ہے، اگر تو اپنے ضمیر میں غوطہ زن ہو تو تجھے "وہی عالم نظر آئے گا یعنی تجھے معلوم ہو گا کہ زمانہ کا کوئی خارجی وجود نہیں ہے، بلکہ اس کا وجود، تیری زندگی کے کارناموں کے اظہار پر منحصر ہے۔

تو نے اپنی گِل یعنی اپنے دماغ میں یہ غلط خیال قائم کر لیا کہ وقت یا زمانہ (TIME) ایک خط[1] (LINE) کی طرح کوئی ممتد وجود رکھتا ہے۔ یعنی تو نے ٹائم کو خط یا لکیر تصور کر لیا۔ اور چونکہ خط کو حصوں میں منقسم کر سکتے ہیں اس لئے لیل و نہار

[1] ہندی یونانی اور نیوٹنی (NEWTONIAN) فلسفہ میں زمانہ کا خارجی وجود تسلیم کیا گیا ہے اور ان حکماء نے زمانہ کو خط کی طرح تصور کیا ہے۔

کو اس کی پیمائش کا آلہ بنا کر اس کو ماضی حال اور استقبال میں تقسیم کر لیا ہے۔ اور چونکہ تُو اپنے آپ کو دن اور رات میں محدود اور محصور سمجھتا ہے، اس لئے تُو نے اپنے آپ کو گردشِ روزگار کا قیدی تصور کر لیا، اور اس تخیل کا نتیجہ یہ نکلا کہ تُو نے زمانہ (TIME) کو اپنے اوپر حکمران قرار دے دیا۔

ہندی اور یونانی حکماء نے اس طرح استدلال کیا ہے۔

"زمانہ باعثِ تکوین حوادث ہے یعنی واقعات، زمانہ کی بدولت رونما ہوتے ہیں اور "زمانہ" انسانی دسترس سے بالاتر ہے اس لئے حوادث روزگار انسانی دسترس سے بالاتر ہیں پھر چونکہ انسان زمانہ کا اسیر ہے یعنی "کال" اس پر مسلط ہے اس لئے انسان اپنی زندگی میں مجبور ہے یہی وجہ ہے کہ ہندی اور یونانی فلسفہ کے زیرِ اثر آ کر ایرانی شعراء نے گردشِ افلاک کو انسانی زندگی پر اثر آفریں بلکہ حکمران، بیان کیا اور رفتہ رفتہ یہ غیر اسلامی تخیل مسلمانوں کے دل و دماغ میں ایسا راسخ ہو گیا کہ اس نے ان کو زمانی "زماں" بنا دیا، چنانچہ آج بھی ہم آپس میں اس طرح اظہارِ فکر کرتے ہیں "دیکھئے گردشِ افلاک کیا رنگ دکھاتی ہے" "دیکھئے زمانہ کون سی کروٹ بدلتا ہے" وغیرہ وغیرہ

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ، گھبرائیں کیا! (غالب)

مطلب ان سب کا ایک ہی ہے کہ انسان مجبور ہے اور زمانہ ان پر مسلط ہے

اس غلط فہمی کا مبنیٰ یہ ہے کہ ہندی اور یونانی حکماء نے زمانہ کو مکان (SPACE) کی طرح ایک خطِ ممتد (EXTENDED LINE) قرار دیا، اور یہ سمجھا کہ یہ ایک دائرہ (چکّر) ہے جس کے گرد ہم گردش کر رہے ہیں۔ چنانچہ روزمرّہ گفتگو میں ہم زمانہ کے چکّر[1] کی ترکیب عموماً استعمال کرتے ہیں اور مطلب زمانہ کی فعالیت (ACTIVITY) ہوتا ہے۔

اب آئندہ اشعار کا مطلب بآسانی سمجھ میں آسکتا ہے۔

در گِلِ خود، تخمِ ظلمت کاشتی　　وقت را مثلِ خطے پنداشتی

باز با پیمانۂ لیل و نہار　　فکرِ تو پیمود طولِ روزگار

یعنی پہلی اور بنیادی غلطی انسان سے یہ ہوئی کہ اُس نے وقت کو لائن تصوّر کیا، اور پھر اس کے طول کو لیل و نہار کے پیمانہ سے ناپا۔

ساختی ایں رشتہ را زنّارِ دوش　　گشتۂ مثلِ بتاں، باطل فروش

اے مسلمان! اے وہ انسان جس کو خدا نے زمانہ پر حکمراں بنایا تھا، تُو نے اس تخیّل کو گویا رشتۂ زنّار بنا لیا اور غلط خیالات کا شکار ہو گیا۔

مسلمی؟ آزاد ایں زنّار باش　　شمعِ بزمِ ملّتِ احرار باش

---

[1] ممکن ہے ہندو فلاسفہ نے حیاتِ انسانی کے چکّر سے زمانہ کے چکّر کا تصوّر مستعار لیا ہو۔ بودھ دھرم کا چکّر تو دُنیا میں مشہور ہے۔ زندگی سے خواہش، خواہش سے عمل، عمل سے جزا و سزا، اور جزا و سزا سے زندگی۔ اسی لئے گوتم نے اس چکّر سے نکلنے کی ترکیب یہ نکالی کہ زندگی ہی کو ختم کر دو۔

آخر علامہؒ نے واضح طور پر لفظ مسلمان استعمال کر ہی لیا۔ فرماتے ہیں:
اے مخاطب کیا تو مسلمان ہے؟ اگر ایسا ہے تو تیرا پہلا فرض یہ ہے کہ اس
زنّار کو گردن سے اُتار ڈال یعنی زمانہ کے اس تخیّل کو دماغ سے نکال دے۔
زمان (TIME یا काल) کا خارج میں کہیں وجود نہیں یہ تو ہمارے
ذہن کی پیداوار ہے یعنی زمانہ کا وجود خارجی نہیں ہے بلکہ ذہنی ہے (TIME
IS SOME THING SUBJECTIVE) اور اس کی بدولت
ہم حیات کا تصوّر کرتے ہیں اگر ہمارے ذہن میں زمانہ کا تصوّر نہ ہو تو حیات
کا تصوّر نہیں ہو سکتا (WITHOUT TIME LIFE IS
UNTHINKABLE)-

تو کہ از اصلِ زماں آگہ نہ / از حیاتِ جاوداں آگہ نہ؟

تو چونکہ زمانہ کی ماہیت سے آگاہ نہیں ہے اس لئے حیاتِ جاوداں
(ETERNAL LIFE) کے مفہوم سے بھی آگاہ نہیں ہو سکتا۔
اب آپ زمان کی تفہیم و تفہّم کے لئے دوسرا پہلو اختیار کرتے ہیں اور حدیث
مشہور لِی مَعَ اللّٰہِ وَقْتٌ سے استفادہ کرتے ہیں۔

تا کجا در روز و شب باشی اسیر / رمزِ وقت از لِی مَعَ اللّٰہِ یاد گیر

یعنی تو کب تک یہ سمجھتا رہے گا کہ زمانہ تجھ پر حکمران ہے؟ تو کب تک اس
غلط فہمی میں مبتلا رہے گا کہ زندگی لیل و نہار ہے؟ اگر تو جویائے حقیقتِ وقت

ہے تو آ میں تجھے ایک طریقہ بتاؤں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث پر غور کر۔

لِی مَعَ اللّٰہِ وَقتٌ لَا یَسعُنِی فِیہِ نَبِیٌّ مُرسَلٌ وَلَا مَلَکٌ مُقَرَّبٌ

یعنی بعض اوقات مجھے خدا کے ساتھ وہ راز و نیاز کا موقع حاصل ہوتا ہے کہ اس تخلیہ کی محفل میں نہ نبی مرسلؑ پا سکتا ہے نہ ملک مقرب۔

مطلب یہ ہے کہ بعض اوقات مجھ پر ایسی کیفیت طاری ہوتی ہے کہ اس کائنات میں مجھے اپنے اور خدا کے علاوہ کسی تیسری چیز کا احساس نہیں ہوتا یعنی وقت، روز و شب یا ماہ و سال کا نام نہیں بلکہ وہ ایک نفسیاتی کیفیت ہے جس کا خارج میں وجود نہیں ہے صرف ذہنِ انسانی اس کا ادراک کرتا ہے۔ کیونکہ وہ اسی کی پیداوار ہے۔

زندگی سرّیست از اسرارِ وقت　　این و آں پیداست از رفتارِ وقت

کائنات میں جو حوادث رونما ہوتے ہیں یہ سب وقت کی رفتار کی بدولت ظہور میں آتے ہیں۔ واضح ہو کہ وقت این و آں یعنی حوادث مظاہر اور واقعات (EVENTS) سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ ایں و آں وقت سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور ٹائم لمحات (سیکنڈ، منٹ) کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ ایک واحد لمحہ ہے۔ یہ جو آپ کے دماغ میں دوش، امروز اور فردا کا تصور پیدا ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے اپنی سہولت کے لئے وقت کی وحدت کو حسب منشاء حصول میں منقسم کر

دیا۔ دراصل زمانہ کوئی مادی شے نہیں بلکہ ایک ذہنی تصور (LOGICAL CONCEPT) ہے۔

ہماری زندگی زمانہ کے اسرار میں سے ایک سر ہے اور زندگی سے مراد فعالیت (ACTIVITY) ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ وقت اور زندگی دونوں ہی راز ہیں۔ وقت کا تصور زندگی یعنی حوادث و واقعات کے بغیر نہیں ہوسکتا اور زندگی کا تصور وقت کے کے بغیر ممکن نہیں۔

چنانچہ اس شعر کی شرح میں علامہؒ نے فرمایا۔

"TIME IS LIFE AND YOU CAN NOT UNDERSTAND LIFE WITHOUT TIME"

اصلِ وقت از گردشِ خورشید نیست　　وقت جاوید است و خور جاوید نیست

یعنی زمان کی اصلیت، اختلافِ لیل و نہار پر مبنی نہیں ہے مثلاً یوں سمجھئے کہ آپ نے رات کو پیمانہ فرض کیا اور تیس دن کا ایک ماہ اور بارہ ماہ کا ایک سال بنایا اور آپ کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ کی وفات کو چار ہزار سال ہوئے تو یہ جو بات آپ نے کہی اعتباری ہے کیونکہ اگر ماہ و سال کا پیمانہ زمین کی گردشِ دوری کے بجائے کچھ اور ہوتا، تو آپ کبھی چار ہزار سال نہ کہتے۔

وقت بذاتہٖ آنی فانی یا عارضی چیز نہیں بلکہ وہ ایک حقیقت ابدی ہے۔

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ زمان تخلیقی حرکت کا (TIME IS ETERNAL) نام ہے اور خدا ہر وقت تخلیق میں مصروف ہے اس لئے زمان، خدائی زندگی (DIVINE LIFE) کا ایک جزو ہے یا اگر یہ لفظ مغالطہ آمیز نظر آئے، تو یوں کہہ لیجے کہ زمان، حیات ایزدی کی ایک شان (ASPECT) ہے۔

کوئی انسان، خدا کے متعلق زمانہ کی قید سے آزاد ہو کر تصوّر نہیں کر سکتا بلکہ خود خدا کے تصوّر کے ساتھ زمانہ کا تصوّر لازمی ہے۔ مثلاً جب آپ کہتے ہیں کہ خدا ہے تو ہمیشہ یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ "ازل سے ہے" اور "وہ ابد تک رہے گا" یعنی خدا تعالیٰ الحیّ ہے یعنی زندگی اس کی صفت ہے۔ لیکن آپ اس کی زندگی کا تصوّر بھی، وقت[1] کے تصوّر سے منزّہ ہو کر نہیں کر سکتے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ خدا زمان و

---

[1] علامہؒ نے فرمایا کہ "وقت زندگی ہے" اس پر اس اعتبار سے بھی غور کیجے کہ فرض کیجے کہ آپ سکتہ کے مرض میں مبتلا ہو گئے اور چھ ماہ تک بے ہوش رہے اب سوال یہ ہے کہ

(۱) کیا اس عرصہ میں آپ وقت کا تصوّر کر سکے؟

اور (۲) جب آپ کو ہوش آیا تو کیا آپ یہ بتا سکتے ہیں کہ کتنی دیر تک یا کتنے دنوں تک آپ غافل رہے؟ آپ جب ہوش میں آئیں گے، تو آپ کو یہی محسوس ہوگا کہ تھوڑی دیر گزری ہے حالانکہ ایک سنہ دو پورے ۱۸۲ دن کے بعد آنکھ کھلی! تو معلوم ہوا کہ ۱۸۲ دن ایک لمحہ کے برابر بھی ہو سکتے ہیں۔ تو اگر ماہرین علم الارض کے چھ لاکھ سال، خدا کے چھ دن کے برابر ہوں تو اس میں کون سی عقلی قباحت ہے؟

مکان کی قید میں ہے بلکہ میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہم لوگ اپنی ہیئت دماغی اور ترکیب ذہنی کی بنا پر مجبور ہیں کہ جب خدا کی زندگی کا تصور کریں، تو اس کو زمانے کے تصور سے جُدا نہیں کر سکتے۔

قصہ مختصر وقت ازلی ہے حالانکہ آفتاب ازلی نہیں ہے وہ تو ایک مادی چیز ہے اور ایک وقت ایسا آئے گا جب وہ فنا ہو جائے گا۔

عیش و غم، عاشور و ہم عید است وقت　　تیرِ باب ماہ و خورشید است وقت

زمانہ کیا ہے؟ عیش بھی ہے غم بھی ہے یعنی جملہ حوادث روزگار جو بظاہر ایک دوسرے کی ضد ہیں، سب وقت ہی کی بدولت رونما ہوتے ہیں۔ انسان وقت کے تصور سے اپنے آپ کو آزاد نہیں کر سکتا۔ عیش اور غم، رنج اور راحت، عاشورہ اور عید غرضیکہ ہر حادثہ کا تصور، بقید زمان ہی کر سکتا ہے۔ بلکہ چاند اور سُورج کی روشنی کا بھی تصور نہ ہو سکے اگر وقت کا تصور نہ ہو۔

وقت را مثلِ مکاں گستردہ؟　　امتیازِ دوش و فردا کردہ؟

تجھ سے بڑی غلطی یہ ہوئی کہ تُو نے زمان کو بھی مکان کی طرح ممتد (EXTENDED) سمجھ لیا اور اس طرح دوش و فردا کا امتیاز پیدا کر لیا۔ یہ غلطی اس لئے ہوئی کہ تُو نے وقت کو مادّی چیز سمجھا حالانکہ وقت، مادّی شے نہیں ہے۔

واضح ہو کہ انسٹائن (EINSTEIN) اور اقبال کے خیالات میں

فرق یہ ہے کہ اول الذکر زمان کو بُعدِ رابع (FOURTH DIAMEN-SION) قرار دیتا ہے یعنی اس کو مادّی شے تصور کرتا ہے۔ لیکن اقبالؒ کا خیال یہ ہے کہ یہ تو ممکن ہے کہ (SERIAL TIME) مادّی ہو لیکن وقت کا جو ذہنی احساس ہمیں حاصل ہوتا ہے وہ مادّی نہیں ہے بلکہ ذہن ہی کی پیداوار ہے اور اسی کا جزو لاینفک ہے۔ برگساں کا یہی خیال ہے

الغرض اقبالؒ کے نزدیک، وقت یا زمانہ خط (LINE) کی طرح نہیں ہے کہ آپ اس کے حصّے کر سکیں مثلاً فلاں حصّہ دوش ہے اور فلاں فردا۔

اے چو بُو رم کردہ از بستانِ خویش ساختی از دستِ خود زندانِ خویش

اے شخص تُو اپنی خودی یا اپنی حقیقت سے اس طرح دُور ہو گیا جس طرح خوشبو غنچہ سے نکل جاتی ہے۔ اور زمان (وقت) کو مادّی اور خارجی شے قرار دے کر مقیّد بالزّمان ہو گیا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ تُو اسیر دوش و فردا نہیں ہے بلکہ دوش و فردا تیرا اسیر ہے۔ زمان کچھ نہیں کرتا، کیونکہ کر نہیں سکتا۔ جو کچھ کرتا ہے تُو کرتا ہے اور جو کچھ ہوتا ہے تجھ سے ہوتا ہے۔

وقتِ ما کو اول و آخر ندید از خیابانِ ضمیرِ ما دمید

وُہ زمانہ جس کا نہ اوّل ہے نہ آخر یعنی زمانِ مطلق، وہ تو تمہارے ہی ذہن (MIND) کی پیداوار ہے یعنی زمانہ کا وجود ذہنی ہے خارجی نہیں۔

زندہ از عرفانِ اصلش زندہ تر ہستی اُو از سحر تابندہ تر

زندہ یعنی انسان، وقت کی اصلیت کے عرفان کی بدولت حقیقی زندگی کا مالک بن سکتا ہے۔ یعنی انسان زندہ ہی اُس وقت ہوتا ہے جب کہ وہ زمان (TIME) کا صحیح عرفان (KNOWLEDGE) حاصل کرے۔

زندگی از دھـــرو دہر از زندگی است

"لاتسبّوا الدھر" فـــرمانِ نبیؐ است

حصولِ عرفان کی صورت یہ ہے کہ اس حقیقت سے واقف ہو جاؤ کہ دہر یعنی زمانہ یا وقت زندگی ہے اور زندگی، زمان ہے۔ اسی لئے تو آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے کہ "زمانے کو بُرا بھلا مت کہو" کیوں؟ اس لئے کہ زمانہ تم سے جُدا کوئی شے نہیں، تم خود زماں ہو۔

اب اس کے عرفان کی صورت یہ ہے کہ

(A) زمانہ، زندگی ہے۔

(B) اور زندگی کا عرفان، ضمیر (خودی) میں غوطہ زن ہونے پہ منحصر ہے۔

(C) لہٰذا زمانہ کا عرفان اگر حاصل کرنا مقصود ہے تو اپنی خودی کا عرفان حاصل کرو۔

جو شخص اپنے آپ سے واقف نہیں وہ زمانہ کی حقیقت سے بھی واقف نہیں ہو سکتا جب تم اپنے من میں ڈوب کر، وقت کی حقیقت سے آگاہ ہو جاؤ گے، تو تمہیں معلوم ہوگا کہ وہ قابلِ پیمائش (MEASUREABLE) نہیں، اور نہ

اس کا اوّل ہے نہ آخر کیوں؟ اس لئے کہ وہ تو ایک ذہنی کیفیت (MENTAL PHENOMENA) ہے۔

جب انسان، زندانِ وقت سے نکل جائے گا، تو وہ زندہ تر ہو جائے گا۔ کس طرح؟ اس طرح کہ پھر وہ اسے اپنے فائدہ کے لئے استعمال کر سکے گا اور اس کی ذات سے خوارق عادت سرزد ہو سکیں گے۔

زندگی کی حقیقت، زمانہ کے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتی کیوں؟ اس لئے کہ در اصل حیات اور زمان دونوں ایک ہی شے کے دو پہلو (ASPECTS) ہیں۔ جب آپ حیات کا تصوّر کرتے ہیں تو زمانہ کی قیود کے تحت۔ اور جب آپ زمانہ کا تصوّر کرتے ہیں تو حیات کے واقعات کے تحت۔ غور سے دیکھئے تو حیات[1] ذہن[2] اور زمانہ[3] تینوں ایک ہی ہیں۔ اسی لئے علّامہ نے فرمایا۔

وقتِ ما کو اوّل و آخر ندید   از خیابانِ ضمیرِ ما دمید

یہاں ضمیر سے مراد ذہن یا نفس ناطقہ ہے۔

ہمارے شعراء نے مسلمانوں کو صدیوں تک یہ خواب آور معجون کھلائی کہ کامیابی کے لئے موزوں وقت کے منتظر رہو۔ اقبالؒ نے صدیوں کے اس جمود کو توڑا اور یہ بتایا کہ جب تک انسان کوشش نہیں کرے گا اس کے لئے موزوں وقت کبھی نہیں آسکتا۔

---

[1] LIFE [2] MIND [3] TIME

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ۔

اور میں سچ کہتا ہوں کہ یہ وہ شاندار ملّی خدمت ہے کہ ہندوستان کے غلام اس کی عظمت اور اہمیت کا صحیح تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔

اگر سلطان محمد فاتح، اپنے عزم آہنین کی بدولت ۱۴۵۳ء میں، اپنے جہازوں کو آبنائے فاسفورس کی "شاخ زرّیں" میں ڈالنے کے لئے، موزوں وقت پیدا نہ کرتا تو وہ وقت آج ترکوں کو نصیب نہ ہوتا۔

اب علاّمہ ایک نکتہ بیان فرماتے ہیں اور اس بات کے نکتہ ہونے میں کیا شک ہے جسے خود حضرت علاّمہؒ نکتہ سے تعبیر کریں۔

نکتۂ می گویمت روشن چو دُرّ   تا شناسی امتیازِ عبد و حُرّ

وہ نکتہ کیا ہے؟ غلام اور آزاد میں فرق۔ ملاحظہ فرمائیے۔

عبد گردد یاوہ در لیل و نہار   در دلِ حُر یاوہ گردد روزگار

غلام کی شناخت یہ ہے کہ وہ زندانیٔ روز و شب ہوتا ہے، اور بندۂ آزاد کی شان یہ ہوتی ہے کہ روز و شب اس کے پابندِ احکام ہوتے ہیں یعنی عبد وہ ہے جس پہ زمانہ حکمران ہو اور حُر وہ ہے جو زمانہ پہ حکمراں ہو۔

اسی مضمون کا ایک شعر جاوید نامہ میں بھی درج ہے۔

آنچہ در عالم نگنجد، آدم است   آنچہ در آدم نگنجد عالم است

اب علامہؒ دوسری بات اسی سلسلہ میں فرماتے ہیں وہ یہ کہ چونکہ عبد یعنی غلام، اپنے زمان کا پابند اور دوامِ صبح و شام میں بطور طائر گرفتار ہوتا ہے اس لئے یکساں طور پہ زندگی بسر کرنا، اس کی فطرت بن جاتی ہے۔ اور اس کی زندگی میں کوئی نُدرت (انوکھا پن) نظر نہیں آتی۔ لیکن مردِ حُر، یکسانیت (MONOTONY) کو برداشت نہیں کر سکتا۔

عبد را تحصیلِ حاصل، فطرت است   واردات جان او، بے ندرت است

دمبدم نو آفرینی کارِ حُر   نغمہ پیہم تازہ ریزد تارِ حُر

یقیناً ناظرین مجھ سے اتفاق کریں گے کہ ہماری قوم کے اکثر دولتمندوں کی زندگی بالکل تحصیل حاصل ہوتی ہے یعنی موسم سرما میں۔

(۱) ۹ یا ۱۰ بجے سو کر اٹھنا، بغیر منہ دھوئے چاء پینا۔

(۲) اس کے بعد حقّہ نوشِ جان کرنا اور بڑا کمال کیا تو کوئی ناول یا عریاں وضع کا لٹریچر پڑھ لیا۔

(۳) قریب ایک بجے، خاصہ تناول فرمانا، اور اس کے بعد قیلولہ یا اگر تضیع اوقات کی صورت ہو گئی تو برج یا گنجفہ سے دلِ زار کو تسکین دینا۔

(۴) شام کو موٹر میں ہوا خوری کے لئے نکل جانا۔

(۵) شب کو بعد طعام، اس دولت کے بل بوتے پر، جو محض اس لئے حاصل ہو گئی ہے کہ وہ دولتمند باپ کے گھر پیدا ہو گئے، اس فعل میں غرق ہو جانا شریعت

اسلامیہ جس کے قریب جانے کی بھی اجازت نہیں دیتی۔

(۶) دو تین بجے سو جانا اور پھر ۹، ۱۰ بجے اُٹھ بیٹھنا غرضکہ اسی چکر میں عمر ختم ہو جاتی ہے (الا ما شاء اللہ)

از گراں خیزی مقامِ او ہماں　　نالہ ہائے صبح و شامِ او ہماں

یہ تو دولتمند غلاموں کا حال ہے اب رہے وہ جو متوسط الحال ہیں۔ وہ بھی اپنے دائرہ ہی میں گردش کرتے ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ وہ جب اپنے گرد و پیش کے حالات پر نظر ڈالتے ہیں، تو تھوڑی دیر کے لئے تقدیر کا رونا رو لیتے ہیں، اور اس کے بعد حسب معمول پھر مرکزی گردش میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

عبد را ایام زنجیر است و بس　　بر لب او حرفِ تقدیر است و بس

جو لوگ زنجیریٔ ایام ہیں، کاہلی، تن آسانی، دون ہمتی، اور پستی ان کی فطرت ثانیہ ہو جاتی ہے، زمانہ جس طرح اُن کو چلاتا ہے اُسی طرح چلتے رہتے ہیں۔ اور اپنی تقدیر کا رونا روتے رہتے ہیں۔

ہمتِ حُر، با قضا گردد مشیر　　حادثات از دستِ او صورت پذیر

علامہؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص وقت پر حکمران ہوتا ہے (اور یہ مقام خود شناسی یعنی عرفانِ "خودی" سے حاصل ہو سکتا ہے) وہ ناسازگار دنیا میں نہیں رہتا بلکہ زندہ ہونے کی وجہ سے اپنی دنیا آپ پیدا کرتا ہے۔

اقبالؒ کا مسلک یہ ہے کہ جو شخص آزاد ہے وہ دوسروں کے جہاں میں رہنا

پسند نہیں کرسکتا۔

بندۂ آزاد را آید گراں زیستن اندر جہانِ دیگراں

اسی لئے وہ فرماتے کہ اے مسلمان!

وہی جہاں ہے ترا جس کو تو کرے پیدا
یہ سنگ و خشت نہیں جو تری نگاہ میں ہے

پس اب ہمیں کفر اور اسلام کا معیار حاصل ہوگیا۔ مسلمان دراصل وہ ہے جس میں قوتِ تخلیق پائی جائے۔

یہی تو وجہ ہے کہ جب اقبالؒ کو عالم تصوّر میں، خدا کی حضوری حاصل ہوئی تو، خدا نے یہ فرمایا۔

ہر کہ او را قوتِ تخلیق نیست نزدِ ما جز کافر و زندیق نیست

اس لئے معلوم ہؤا کہ مسلمان وہ ہے جس میں قوتِ تخلیق[1] پائی جائے اسی لئے اقبالؒ کہتے ہیں:۔

اپنی دُنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے

پھر ایک جگہ یوں تلقین فرماتے ہیں کہ مسلمان وہ ہے جو

پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

---

[1] CREATIVE ACTIVITY

اس کی وجہ یہ ہے کہ خود کارکنان قضا و قدر کا یہ قول ہے۔

گفتند جہانِ ما آیا بتو می سازد؟ گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زن

سوال یہ ہے کہ مسلمان میں یہ طاقت کیسے پیدا ہو؟ اس کا جواب اقبالؒ نے یہ دیا ہے کہ قرآن یہ نعمت انسان کو عطا کر سکتا ہے۔

کہنہ گردد چوں جہاں اندر برش می دہد قرآں جہانے دیگرش

قرآن مجید نئی دُنیاوں کا ایک زبردست خزانہ ہے، اسی لئے اقبالؒ نے اعلیحضرت شاہ افغانستان کو یہ نصیحت فرمائی۔

صد جہاں باقیست در قرآں ہنوز اندر آیاتش یکے خود را بسوز

ہمت حُر با قضا گردد مشیر حادثات از دست او صورت پذیر

لیکن مردِ حُر، قضا کا مشیر بن جاتا ہے اور اس لئے عالم میں وہ واقعات رُونما ہوتے ہیں، جو وہ چاہتا ہے۔

ترکی کے دشمنوں نے کہا "ترکی کو ہمارا غلام بن جانا چاہئے" مصطفےٰ کمال نے کہا "نہیں، ایسا نہیں ہوگا"

چونکہ مصطفےٰ کمال، اپنی خودی کے عرفان کی بدولت وقت پر حکمران ہو گیا تھا اس لئے زمانہ اس کا فرمان پذیر بن گیا، اور ترکی میں جو حالات رونما ہوئے وہ اس کے ہاتھ سے صورت پذیر ہو کر عالم میں رونما ہوتے تھے۔

معرکہ سقاریہ میں یہ مردِ حُر باوجودیکہ نموتیا اور ذات الجنب جیسے جاں گسل

امراض کا شکار رہا۔ سترہ دن اور سترہ رات بہیم گھوڑے کی پشت پر سوار رہا۔

واضح ہو کہ ایام کا یہ شمار، ہمارا یعنی غلاموں کا ہے۔ بندۂ آزاد زمانہ کو روز و شب کے پیمانہ سے نہیں ناپتا، اس کی نظر میں سترہ دن سترہ منٹ سے بھی کم ہوتے ہیں۔ ورنہ آپ خود ہی انصاف کریں کوئی شخص جو ایسے امراض میں گرفتار ہو، سترہ دن تک معرکہ جنگ و جدل میں حصہ لے سکتا ہے؟

اب سوال یہ ہے کہ بندۂ آزاد کے شمار روز و شب کا معیار کیا ہے؟ اور کیوں سترہ دن اس کی نظر میں سترہ منٹ سے بھی کم ہوتے ہیں کہ وقت تو ذہنی کیفیت کا نام ہے، نہ کہ کسی موجود فی الخارج کا، اور جو شخص راز حیات سے آگاہ ہوتا ہے، سرِ وقت سے بھی آگاہ ہوتا ہے ع

ذوق ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی

والا معاملہ ہے جو اپنی خودی سے واقف نہ ہو وہ اس راز سے بھی واقف نہیں ہو سکتا کہ سترہ دن، سترہ منٹ سے کم کیسے ہو سکتے ہیں۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے اعلیٰ منطق[1] کی ضرورت ہے معمولی منطق[2] یہاں بالکل نہیں چل سکتی چنانچہ علامہؒ فرماتے ہیں۔

رفتہ و آیندہ در موجودِ او   دیرہا آسودہ اندر زودِ او

بندۂ حر کے زمانہ موجود میں ماضی بھی ہوتا ہے اور مستقبل بھی، اور اس کے

---

[1] HIGHER LOGIC [2] FORMAL LOGIC

لمحات میں ایام، اور ایام میں لمحات پوشیدہ ہوتے ہیں۔ لیکن یہ بات لفظوں یا منطقی دلیلوں سے سمجھ میں نہیں آسکتی۔

آمد از صوت و صدا پاک ایں سخن — در نمی آید بہ ادراک ایں سخن

گفتم و حرفم ز معنی شرمسار — شکوۂ معنی کہ حرفم را چہ کار

زندہ معنی چوں بحرف آمد بمرد — از نفس ہائے تو نارِ او فسرد

یعنی یہ باتیں ایسی ہیں کہ لفظوں میں بیان نہیں کی جاسکتیں اگرچہ میں نے کہنے کو یہ کہہ دیا کہ

رفتہ و آیندہ در موجودِ او — دہر ہا آسودہ اندر زودِ او

لیکن میرا مفہوم اِن لفظوں سے ادا نہیں ہوا، کیوں؟ محض اس لئے کہ ہو نہیں سکتا۔ مفہوم اس درجہ نازک اور لطیف ہے کہ الفاظ کا بار نہیں اٹھا سکتا اس بات کا تعلق ادراک[1] سے نہیں ہے بلکہ وجدان[2] سے ہے اور وجدانیت کو انسان لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ مثلاً محبوب کے خندۂ زیر لب سے قلب عاشق کی جو حالت ہوتی ہے، کوئی شخص اس کا بیان الفاظ کے ذریعہ سے نہیں کر سکتا۔

تو سوال ہو سکتا ہے کہ پھر اس کی تفہیم کی صورت کیا ہے؟ یعنی رفتہ و موجود یا غیب و حضور کو کس طرح سمجھا جائے؟ علامہؒ فرماتے ہیں۔

---

[2] INTIUTION

[1] REASON

نکتۂ غیب و حضور اندر دل است — رمزِ ایام مرور اندر دل است

نغمۂ خاموش دارد سازِ وقت — غوطہ در دل زن کہ بینی رازِ وقت

یعنی ماضی، حال اور استقبال کی حقیقت خود تیرے دل میں پوشیدہ ہے لہذا اپنے دل میں غوطہ لگا، تو تجھے وقت کا راز معلوم ہو سکے گا۔ غوطہ در دل زدن سے مراد ہے اپنی خودی کا عرفان حاصل کرنا، عارفِ خودی کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

میشود پردۂ چشم پرِ کاہے گاہے — دیدہ ام ہر دو جہاں را بہ نگاہے گاہے

اب اگر کوئی عامی یہ سوال کرے کہ دونوں جہان کو ایک نظر میں کس طرح دیکھا جا سکتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ خودی کی معرفت حاصل کرلو پھر پوچھنے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی کیونکہ خود دیکھ سکو گے۔

کسی بات کا لفظوں کے ذریعہ سے بیان میں نہ آنا اس کے بطلان یا اس کے عدم پر دلیل نہیں ہے مثلاً

(۱) میٹھی چیز کی مٹھاس کی کیفیت لفظوں میں بیان نہیں کی جاسکتی لیکن محض اس بنا پر کوئی شخص مٹھاس کا انکار نہیں کر سکتا۔

(۲) محبت آمیز نگاہ سے دل پہ جو اثر مرتب ہوتا ہے وہ لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا بایں ہمہ کوئی شخص اس کے اثر سے انکار نہیں کر سکتا۔

(۳) راگ سُن کر دل پر جو کیفیت طاری ہوتی ہے اُسے لفظوں میں بیان نہیں کر سکتے لیکن کیفیت کے وجود سے انکار نہیں ہو سکتا۔

(۴) آنکھ اور دماغ میں کیا تعلق ہے اس کو لفظوں میں بیان نہیں کر سکتے لیکن علاقہ کی حقیقت سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔

(۵) آکسیجن اور ہائیڈروجن میں جو علاقہ ہے کہ ان دونوں کے ملنے سے پانی بن جاتا ہے اُسے لفظوں میں بیان نہیں کر سکتے کیونکہ جب لیباٹری میں دونوں کو ایک خاص تناسب سے ملاتے ہیں تو فی الحقیقت پانی بن جاتا ہے۔

بس اسی طرح مذہبی تجارب کا حال ہے بعض باتیں ایسی ہیں کہ انہیں لفظوں کے ذریعہ سے بیان نہیں کر سکتے لیکن عمل سے اُن کا ثبوت ملتا ہے مثلاً حیات، خودی، ادراک، اور زمان ان حقائق کی حقیقت لفظوں میں بیان نہیں کی جا سکتی۔

اب اگر یہ چاہیں کہ ایک بہرہ آدمی موسیقی کی لذت سے یا ایک اندھا آدمی مصوری کی لذت سے بہرہ اندوز ہو سکے تو یہ ممکن نہیں کیونکہ موسیقی کا تعلق سماعت سے ہے اور بہرہ آدمی سماعت سے محروم ہے۔

ٹھیک اسی طرح حیات، خودی، ادراک، زمان اور خدا کی حقیقت سے بہرہ اندوز ہونے کے لئے روحانی حس کی ضرورت ہے اور چونکہ عقل کا مدار حواس جسمانی پر ہے اس لئے مجرد عقل ان حقائق کا ادراک نہیں کر سکتی۔ یہ حقائق عقل کی دسترس سے بالاتر ہیں۔ بڑی غلطی تعلیم یافتہ طبقہ کو آج کل یہ لگی ہوئی ہے کہ وہ روحانی حقائق کا

ادراک، مادی آلات کے واسطہ سے کرنا چاہنا چاہتا ہے حالانکہ غور سے دیکھا جائے تو یہ کوشش ایسی ہی ہے جیسے بنئے کے ترازو میں آواز یا روشنی کو تولنا اور فیتہ سے کرہوا کو ناپنا۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ گلاب کی خوشبو محسوس کرنے کے لئے اُسے کان یا زبان پر رکھنا اور فونوگراف کی نلکی کو ناک میں لگانا۔

جب ایک شخص یہ پڑھتا ہے کہ حضرت علیؓ جب بایاں پاؤں رکاب میں رکھتے تھے تو الحمد سے قرآن کی تلاوت شروع کرتے تھے اور جب دایاں پاؤں رکاب میں ڈالتے تھے تو والناس تک پہنچ جاتے تھے تو وہ حیران رہ جاتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک منٹ میں ایک شخص ۶۰ ہزار سے زاید الفاظ زبان سے ادا کر سکے؟ اس کے لئے تو کم از کم ۱۲ × ۶۰ = ۷۲۰ منٹ درکار ہیں اس کا جواب صوفیاء کی زبان سے یہ ہے کہ علیؓ کے مقام پہ پہنچ جاؤ تم بھی ایسا کر سکو گے اور اقبالؔ کی زبان سے یہ ہے کہ

نغمۂ خاموش دارد سازِ وقت غوطہ در دل زن کہ بینی رازِ وقت

جہانگیر کے زمانہ میں انگریزوں کو لندن سے کراچی پہنچنے میں تین سال لگتے تھے، لیکن ہمارے زمانہ میں لندن سے کراچی کا فاصلہ ۳ دن میں طے ہو سکتا ہے یعنی جو کام سر طامس رو نے تین سال میں کیا وہ آج ۳ دن میں ہو سکتا ہے گویا اس کے تین سال ہمارے تین دن کے برابر ہیں اس صورت میں اس میں کیا استحالہ ہے کہ علیؓ کا ایک منٹ یوسف علیہ السلام کے ۷۲۰ منٹ کے برابر ہو؟

پیدل کے لئے از لاہور تا دہلی ۱۰ دن کا فاصلہ ہے لیکن ہوائی جہاز کے لئے یہی فاصلہ تین گھنٹے کا ہے۔ کیوں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہوائی جہاز کے چلانے والے نے مکان پر پیدل کے مقابلہ میں بہت زیادہ قابو حاصل کر لیا ہے۔ ٹھیک اسی طرح ہم جس کام کو ۲۰ منٹ میں کرتے ہیں، علیؓ اس کام کو ایک منٹ میں کر سکتے تھے کیوں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انہوں نے ہمارے مقابلہ میں، زمان پر بہت قابو حاصل کر لیا تھا۔ اس میں پیچیدگی کیا ہے۔

اگر انسانی زندگی میں پہلی بات کی قوت موجود ہے تو دوسری بات کی بھی ہے۔ اگر وہ طاقت ہمارے اندر موجود نہ ہو تو اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ کسی میں بھی موجود نہیں ہو سکتی؟

ضرورت بحث کی نہیں، ضرورت عمل کی ہے اور افسوس ہے کہ اس کی طرف ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کی توجہ بالکل مبذول نہیں ہوتی۔ یہ تو سچ ہے کہ علیؓ نے ایک جھٹکے میں خیبر کا دروازہ اکھاڑ کر پھینک دیا تھا۔ لیکن ایسا کرنے سے پہلے انہوں نے میوۂ تسلیم و رضا کی بدولت اپنے بازوؤں میں طاقت بھی پیدا کر لی تھی۔ ہمارا کیا حال ہے؟ ہم نانِ جویں کے بجائے وہ نان جس کے متعلق اقبالؒ یہ لکھتے ہیں ؎

تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیالِ فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری

TIME زمان SPACE مکان

ہم اس نانِ جویں کے بجائے نہ صرف مرغِ مسلّم کھاتے ہیں بلکہ مقصدِ حیات ہی کھانے پینے کو سمجھتے ہیں۔ غرضیکہ ہر ممکن طریق سے روح کو فنا کرتے ہیں یا کرنے کے درپے رہتے ہیں۔ اور پھر یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے بازوؤں میں بھی وہی قوتِ حیدری ہو اور ہمارے معرکوں میں بھی وہ شانِ کراری پیدا ہو جائے اور چونکہ نہیں ہوتی اس لئے علیؓ کے بازوؤں میں بھی نہیں تھی اور چونکہ نہیں تھی اس لئے واقعۂ انفکاکِ درِ خیبر اور واقعۂ قتلِ مرحب یہ سب افسانے (MYTHS) ہیں۔

ہم خان بہادری کے لئے اپنا ایمان فروخت کرنے کے لئے تیار ہیں۔ چار مربعوں کے لئے ملت فروشی پر آمادہ ہیں۔ وزارت کے لئے ساری قوم کو برباد کر دینے پر تلے ہوئے ہیں اور اسمبلی کی رکنیت کے لئے مسجدِ شہید کی اینٹوں کو فروخت کر دینے پہ تہیہ کئے ہوئے ہیں اور ان سب غداریوں کے باوجود ہم خدا سے یہ شکوہ کرتے ہیں کہ ہم غلام کیوں ہیں؟ اور رات دن یہ شعر وردِ زبان ہے۔ ؎

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

آہ! میں اپنی از خود رفتہ قوم کو کس طرح سمجھاؤں کہ خدا کا قانون کسی قوم کے لئے نہیں بدل سکتا۔ وہ قانون یہ ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ

آہ! میں اپنی ملت گم گشتہ کو کس طرح اس حقیقت سے آگاہ کروں کہ محمدؐ (روحی لہ الفدا) سے بے وفائی کرکے تم دنیا میں سربلند نہیں ہو سکتے۔

آہ میری قوم کانگرس سے اظہار وفاداری کر رہی ہے اور خدا ـــــ جس نے محمدؐ کو بھیجا۔ کا قول یہ ہے ؎

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

اے مسلمانو! گاندھی اور نہرو، کارل مارکس اور روسو، ان سب سے اپنا تعلق منقطع کر لو۔ یہ تمہارے محبوب نہیں ہیں۔ یہ تمہارے محبوب ہو نہیں سکتے۔ تمہارا محبوب محمدؐ ہے۔ تمہارے مرض کا علاج نہ وردھا میں ہے نہ لندن میں، بلکہ یثرب میں ہے ؎

خاکِ یثرب از دو عالم خوشتر است
اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است

تم یثرب کے خواب کو طوطیائے چشم بناؤ۔ ساحرانِ فرنگ اور جادوگرانِ ہند دونوں کا طلسم پاش پاش ہو جائے گا ؎

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

آخر میں حضرتِ علامہ مسلمانوں کی شاندار ماضی کا تذکرہ کرتے ہیں ؎

یاد ایامے کہ سیفِ روزگار

با توانا دستئ ما بود یار

تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ؎

ناخنِ ما عقدۂ دنیا کشاد

بختِ ایں خاک از سجودِ ما کشاد

اس داستاں سرائی کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان اپنے اجداد کے شاندار کارناموں کا مطالعہ کریں اور اپنے اندر وہی رنگ پیدا کریں تاکہ اللہ تعالیٰ کا نام از سرِ نو دُنیا میں بلند ہو سکے۔

قرآنِ مجید میں مسلمانوں کو اللہ تعالےٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی قرار دیا ہے۔ پس ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اپنے اندر یہ شان پیدا کرنے کی کوشش کرے اور مجھے یقین ہے کہ اگر مسلمان اپنے حقیقی حکام سے آگاہ ہو جائیں اور یہ بات علم کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی، تو وہ دوبارہ دنیا میں "آیتِ حق" بن سکتے ہیں۔ لہذا مثنوی کے پڑھنے والے کو اس حقیقت سے آگاہ ہو جانا چاہئے کہ

ذاتِ ما آئینۂ ذاتِ حق است

ہستئ مسلم ز آیاتِ حق است

خاتمہ

اس منزل پر اسرارِ خودی ختم ہو جاتی ہے اور اب علامہ خدا سے یہ دعا کرتے ہیں کہ

از تہی دستاں رُخِ زیبا مپوش
عشقِ سلمانؓ و بلالؓ ارزاں فروش
چشمِ بے خواب و دلِ بے تاب دہ
باز ما را فطرتِ سیماب دہ

یعنی اے خدا اِس زمانے کے مسلمان عاشقانِ خام ہیں۔ اُن کو صفتِ عشق میں پختہ کر دے اور ہماری قوم میں سلمانؓ اور بلالؓ کے ٹائپ کے مسلمان پیدا کر جن کی آنکھ اور دل بیتاب ہوں۔ مسلمانوں کی ذلت و خواری کا باعث یہ ہے کہ

رشتۂ وحدت چو قوم از دست داد
صد گرہ بر روئے کارِ ما فتاد

ما پریشاں در جہاں چوں اختریم
ہمدم و بیگانہ از یک دیگر ایم

ان میں وحدتِ ملی مفقود ہو گئی ہے اور اس لئے وہ منتشر اور پراگندہ ہو گئے اور ایک دوسرے سے بیگانہ نظر آتے ہیں۔

یہ وحدت جس پر مسلمانوں کی ترقی کا دارومدار ہے عشق سے پیدا ہو سکتی ہے اور عشق، توحید کو حرزِ جان بنانے سے پیدا ہو سکتا ہے ؎

باز آئینِ محبت تازہ کن
باز ایں اوراق را شیرازہ کن
عشق را از شغلِ "لا" آگاہ کن
آشنائے رمزِ "الا اللہ" کن

مسلمانوں کے لئے دعا کرنے کے بعد اب اقبالؔ خود اپنے حالِ دل کا اظہار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے خدا، اس ملک میں نو کروڑ مسلمان آباد ہیں لیکن مَیں یہ محسوس کرتا ہوں کہ بالکل تنہا ہوں ؎

دل بدوش و دیدہ بر فردا ستم
در میانِ انجمن تنہا ستم
در جہاں یا ربّ! ندیم من کجاست
نخلِ سینائم کلیمِ من کجاست

اے خدا میرے سینہ میں آگ دھک رہی ہے۔ ایسی آگ جس نے میرے ہوش و حواس کو جلا کر خاکِ سیاہ کر دیا۔ مجھے دیوانہ بنا دیا ؎

زالِ من بر خود ستمہا کردہ ام
شعلہ را در بغل پروردہ ام
شعلۂ غارت گرِ سامانِ ہوش
آتشِ افگندہ در دامانِ ہوش
عقل را دیوانگی آموختہ
علم را سامانِ ہستی سوختہ

اے خدا اس زمانے کے مسلمانوں کا سینہ دل سے خالی نظر آتا ہے جو آگ میرے دل میں بھڑک رہی ہے وہ کسی مسلمان کے سینہ میں نظر نہیں آتی۔ میں کب تک اس طرح تنہا جلتا رہوں گا ؎

سینۂ عصرِ من از دل خالی است
مے تپد مجنوں کہ محمل خالی است
شعلے را تنہا تپیدن سہل نیست
آہ یک پروانۂ من اہل نیست
انتظارے غم گسارے تا کجا
جستجوئے رازدارے تا کجا

اے خدا! یا تو یہ امانت مجھ سے واپس لے لے یا مجھے کوئی ہمدم عطا کر تاکہ وہ میری غمگساری کر سکے، میرے درد میں شریک ہو سکے ؎

ایں امانت باز گیر از سینہ ام
خارِ جوہر برکش از آئینہ ام
یا مرا یک ہمدمے دیرینہ دہ
عشق عالم سوز را آئینہ دہ

اے خدا! کائنات کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمدردی یہاں کا قانون ہے۔ کوئی چیز تنہا زندگی بسر نہیں کرتی ؎

موج در بحر است ہا پہلوئے موج
ہست با ہمدم تپیدن خوئے موج
بر فلک کوکب ندیم کوکب است
ماہِ تاباں سر بزانوئے شب است
روز پہلوئے شبِ یلدا زند
خویش را امروز بر فردا زند
ہستیٔ جوئے بجوئے گم شود
موجۂ بادے ببوئے گم شود

ہست در ہر گوشۂ ویرانہ رقص ۔۔۔ مے کند دیوانہ با دیوانہ رقص

اے خدا! اگرچہ تو اپنی ذات کے اعتبار سے یکتا ہے لیکن تنہائی ایسی چیز ہے جسے تو نے بھی پسند نہ کیا ؎

گرچہ تو در ذاتِ خود یکتاستی
عالمے از بہرِ خویش آراستی

اے خدا! پھر میں تنہا کیوں کر زندگی بسر کروں ؎

من مثالِ لالۂ صحراستم — درمیانِ محفلے تنہاستم
خواہم از لطفِ تو یارے ہمدمے — از رموزِ فطرتِ من محرمے

تاکہ میں اُس کے سینے میں بھی وہی آگ روشن کردوں جو میرے سینے میں سلگ رہی ہے اور پھر اُسے آئینہ سمجھ کر اپنی صورت اس میں دیکھوں یعنی تنہائی دور ہوسکے ؎

تا بجانِ او سپارم ہوئے خویش — باز بینم در دلِ او روئے خویش
سازم از مشتِ گلے خود پیکرش — ہم صنم او را شوم ہم آذرش

یہ مثنوی علامہ نے ۱۹۱۴ء میں لکھی تھی۔ اُس وقت وہ بلا شبہ درمیانِ انجمن تنہا تھے۔ مسلمانوں نے مثنوی کے مطالب کو (APPRECIATE) کرنے کے عوض اُس کی تردید شائع کی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی یہ دُعا

بول فرمائی اور بیس سال کے بعد ۱۹۳۴ء میں بالِ جبریل میں خود انہوں نے یہ لکھا ؎

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں یہاں اب میرے رازداں اور بھی ہیں

اور اس کم سواد بلکہ ابجد خواں نے جو یہ ادنیٰ کوشش اس مثنوی کے مطالب عام فہم بنانے کے لئے کی ہے اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ اس ملک میں اقبال کے ہمدموں کی ایک ایسی زبردست جماعت پیدا ہو جائے جس کے سینہ میں ملت کی بہبود کے لئے وہی آگ روشن ہو جو تیس سال تک مسلسل اقبال کو جلاتی رہی۔ مسلمانو! اقبال تو ساری عمر اس آگ میں جلتا رہا۔ مرنے سے تین گھنٹے پہلے بھی اس کے دل کی سوزش بدستور رہی۔

علامہ کے ایک شیدائی محبی خواجہ حسن اختر صاحب کا بیان ہے کہ ۲۰ اور ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کی درمیانی شب میں ۱ اور ۲ کے درمیان علامہ لیٹے لیٹے دفعتہً اٹھ کر بیٹھ گئے اور تھوڑی دیر کے بعد اُن کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے ہم لوگ جو پاس بیٹھے ہوئے تھے، یہ ماجرا دیکھ کر گھبرا گئے۔ اور دریافت کیا کہ خیر تو ہے؟ جواب دیا ہاں، خیر ہے۔ ہم نے سبب گریہ پوچھا تو کہا، اس وقت میرے دل میں ایک خیال آ گیا کہ میں نے تو مسلمانوں کو کامیابی کا راستہ دکھا دیا ہے۔ لیکن انہوں نے میرے مشورے پر عمل نہ کیا تو اُن کا کیا حال ہو گا۔ بس اس خیال نے مجھے تڑپا دیا۔

مسلمانو! اقبالؔ تو تمہیں زندگی کا طریقہ بتا کر رخصت ہو گئے چنانچہ وہ خود کہتے ہیں ؎

زیارت گاہِ اہلِ عزم و ہمت ہے لحد میری
کہ خاکِ راہ کو میں نے بتایا رازِ الوندی

بلکہ وہ تو اپنے آقا اور مولا کی خدمت میں بھی اپنی سعیِ ساٹھ سالہ کارگزاری کی رپورٹ بایں الفاظ پیش کر چکے ہیں ؎

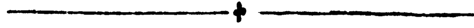
حضورِ ملتِ بیضا تپیدم
نوائے دلگدازے آفریدم
ادب گوید سخن را مختصر گو
تپیدم، آفریدم، آرمیدم

سوال یہ ہے کیا تم نے عشق کی وہ آگ اپنے سینوں میں سلگائی ہے؟ کیا تم لذتِ سوزِ جگر سے آشنا ہو گئے ہو؟ اگر تم نے ایسا نہیں کیا ہے تو اب وقت ضائع کرنے کا موقع نہیں۔ پانی دم بدم بڑھ رہا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تم پروگرام ہی تجویز کرتے رہو اور ریزولیوشن ہی پاس کرتے رہو اور پانی سر سے گذر جائے۔ پھر یہ جلسے اور جلوس، نعرے اور جھنڈے سب بیکار ہو جائیں گے اور اس ملک میں ایک نئی بساط بچھ جائے گی جس میں ہر جگہ "سواستیکا" اور "گیتی" کا چمتکار ہو گا۔

آؤ قرآن مجید کا دامن تھام لیں۔ آؤ واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً پر

عمل کر کے پھر عزت کی زندگی بسر کرنے کا سامان کر لیں۔ میں نے عزم بالجزم کر لیا ہے کہ جب تک زندہ ہوں، مسلمانوں کو اقبالؔ کے پیغام کی طرف بلاتا رہوں گا۔ اور انشاء اللہ تعالیٰ ؎

میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہو گی آہ میری، نفس مرا شعلہ بار ہو گا



تتمہ

دیباچہ مثنوی اسرارِ خودی

(اشاعت اوّل ۱۹۱۴ء)

از علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ

یہ وحدت وجدانی یا شعور کا روشن نقطہ جس سے تمام انسانی تخیلات و جذبات و تمنّیات مستنیر ہوتے ہیں۔ یہ پُراسرار شے جو فطرتِ انسانی کی منتشر اور غیر محدود کیفیتوں کی شیرازہ بند ہے۔ یہ "خودی" یا "انا" یا "میں" جو اپنے عمل کی رو سے ظاہر اور اپنی حقیقت کی رو سے مضمر ہے جو تمام مشاہدات کی خالق ہے مگر جس کی لطافت مشاہدہ کی گرم نگاہوں کی تاب نہیں لا سکتی کیا چیز ہے؟ کیا یہ ایک لازوال حقیقت ہے یا زندگی نے محض عارضی طور پر اپنی فوری عملی اغراض کے حصول کی خاطر اپنے آپ کو اس فریب تخیل یا دروغ مصلحت آمیز کی صورت میں نمایاں

کیا ہے۔ اخلاقی اعتبار سے افراد و اقوام کا طرزِ عمل اس نہایت ضروری سوال کے جواب پر منحصر ہے اور یہی وجہ ہے کہ دنیا کی کوئی قوم ایسی نہ ہوگی جس کے حکماء اور علماء نے کسی نہ کسی صورت میں اس سوال کا جواب پیدا کرنے کے لئے دماغ سوزی نہ کی ہو۔ مگر اس سوال کا جواب افراد و اقوام کی دماغی قابلیت پر اس قدر انحصار نہیں رکھتا جس قدر کہ اُن کی افتادِ طبیعت پر۔ مشرق کی فلسفی مزاج قومیں زیادہ تر اس نتیجہ کی طرف مائل ہوئیں کہ انسانی 'انا' محض فریبِ تخیل ہے اور اس پھندے کو گلے سے اتار دینے کا نام نجات ہے۔ مغربی اقوام کا عملی مذاق ان کو ایسے نتائج کی طرف لے گیا جس کے لئے اُن کی فطرت متقاضی تھی۔

ہندو قوم کے دل و دماغ میں عملیات و نظریات کی ایک عجیب طریق سے آمیزش ہوئی ہے۔ اس قوم کے موشگاف حکماء نے قوتِ عمل کی حقیقت پر نہایت دقیق بحث کی ہے اور بالآخر اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ انا کی حیات کا یہ مشہور تسلسل جو تمام آلام و مصائب کی جڑ ہے عمل سے متعین ہوتا ہے یا یوں کہئے کہ انسانی انا کی موجودہ کیفیات اور لوازمات اس کے گذشتہ طریق عمل کا لازمی نتیجہ ہیں اور جب تک یہ قانونِ عمل کام کرتا رہے گا وہی نتائج پیدا ہوتے رہیں گے۔ انیسویں صدی کے مشہور جرمن شاعر گوئٹے کا ہیرو فوسٹ جب انجیل یوحنا کی پہلی آیت میں لفظ کلام کی جگہ لفظ عمل پڑھتا ہے (ابتدا میں کلام تھا کلام خدا کے ساتھ اور کلام ہی خدا تھا) تو حقیقت میں اس کی دقیقہ رس نگاہ اسی نکتہ کو دیکھتی ہے جس کو ہندو حکماء نے صدیوں

پہلے دیکھ لیا تھا اس عجیب و غریب طریق پر ہندو حکماء نے تقدیر کی مطلق العنانی اور انسانی حریت اور بالفاظ دیگر جبر و اختیار کی گتھی کو سلجھایا اور اس میں کچھ شک نہیں کہ فلسفیانہ لحاظ سے ان کی جدت طرازی داد و تحسین کی مستحق ہے اور بالخصوص اس وجہ سے کہ وہ ایک بہت بڑی اخلاقی جرات کے ساتھ ان تمام فلسفیانہ نتائج کو بھی قبول کرتے ہیں جو اس قضیہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ یعنی یہ کہ جب انا کی تعین عمل سے ہے تو انا کے پھندے سے نکلنے کا ایک ہی طریق ہے اور وہ ترک عمل ہے۔ یہ نتیجہ انفرادی اور ملی پہلو سے نہایت خطرناک ہے اور اس بات کا مقتضی تھا کہ کوئی مجدد پیدا ہو جو ترک عمل کے اصلی مفہوم کو واضح کرے۔ بنی نوع انسان کی ذہنی تاریخ میں سری کرشن کا نام ہمیشہ ادب و احترام سے لیا جائے گا کہ اس عظیم الشان انسان نے ایک نہایت دلفریب پیرائے میں اپنے ملک و قوم کی فلسفیانہ روایات کی تنقید کی اور اس حقیقت کو آشکار کیا کہ ترک عمل سے مراد ترک کلی نہیں ہے کیونکہ عمل اقتضائے فطرت ہے اور اس سے زندگی کا استحکام ہے بلکہ ترک عمل سے مراد یہ ہے کہ عمل اور اس کے نتائج سے مطلق دلبستگی نہ ہو سری کرشن کے بعد سری رام نوج بھی اسی راستے پر چلے مگر افسوس ہے جس عروس معنی کو سری کرشن اور سری رام نوج بے نقاب کرنا چاہتے تھے سری شنکر کے منطقی طلسم نے اسے پھر محجوب کر دیا اور سری کرشن کی قوم ان کی تجدید کے ثمر سے محروم رہ گئی۔

مغربی ایشیا میں اسلامی تحریک بھی ایک نہایت زبردست پیغام عمل تھی گو اس تحریک کے نزدیک انا ایک مخلوق ہستی ہے جو عمل سے لازوال ہو سکتی ہے مگر مسئلہ انا کی تحقیق و تدقیق میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی ذہنی تاریخ میں ایک عجیب و غریب مماثلت ہے اور وہ یہ کہ جس نکتہ خیال سے سری شنکر نے گیتا کی تفسیر کی اس نکتہ خیال سے شیخ محی الدین ابن عربی اندلسی نے قرآن شریف کی تفسیر کی جس نے مسلمانوں کے دل و دماغ پر نہایت گہرا اثر ڈالا ہے۔ شیخ اکبر کے علم و فضل اور ان کی زبردست شخصیت نے مسئلہ وحدت الوجود جس کے وہ انتھک مفسر تھے اسلامی تخیل کا ایک لاینفک عنصر بنا دیا۔ اوحد الدین کرمانی اور فخر الدین عراقی ان کی تعلیم سے نہایت متاثر ہوئے اور رفتہ رفتہ چودھویں صدی کے تمام عجمی شعرا اس رنگ میں رنگین ہو گئے ایرانیوں کی نازک مزاج اور لطیف الطبع قوم اس طویل دماغی مشقت کی کہاں متحمل ہو سکتی تھی جو جزو سے کل تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے انہوں نے جزو اور کل کا دشوار گذار درمیانی فاصلہ تخیل کی مدد سے طے کر کے "رگ چراغ" میں "خون آفتاب" کا اور "شرار سنگ" میں "جلوۂ طور" کا بلا واسطہ مشاہدہ کیا۔

مختصر یہ کہ ہندو حکماء نے مسئلہ وحدت الوجود کے اسباب میں دماغ کو اپنا مخاطب کیا مگر ایرانی شعرا نے اس مسئلے کی تفسیر میں زیادہ خطرناک طریق اختیار کیا یعنی انہوں نے دل کو اپنی آماجگاہ بنایا۔ اور ان کی حسین و جمیل نکتہ آفرینیوں کا آخر کار یہ نتیجہ ہوا کہ اس مسئلے نے عوام تک پہنچ کر قریباً تمام اسلامی اقوام کو ذوقِ عمل سے محروم کر دیا۔

علماء قوم میں سب سے پہلے غالباً ابن تیمیہ علیہ الرحمۃ اور حکماء میں واحد محمود نے اسلامی تخیل کے اس ہمہ گیر میلان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی مگر افسوس ہے کہ واحد محمود کی تصانیف آج ناپید ہیں۔ ملا محسن فانی کشمیری نے اپنی کتاب دبستان مذاہب میں اس حکیم کا تھوڑا سا تذکرہ لکھا ہے جس سے اس کے خیالات کا پورا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ابن تیمیہ کی زبردست منطق نے کچھ نہ کچھ اثر ضرور کیا مگر حق یہ ہے کہ منطق کی خشکی شعر کی دلربائی کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

شعرا میں شیخ علی حزیں نے یہ کہہ کر "تصوف برائے شعر گفتن خوب است" اس بات کا ثبوت دیا ہے کہ وہ حقیقت حال سے آگاہ تھے مگر باوجود اس بات کے ان کا کلام شاہد ہے کہ وہ اپنے گردوپیش کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکے ان حالات میں یہ کیونکر ممکن تھا کہ ہندوستان میں اسلامی تخیل اپنے عملی ذوق کو محفوظ رکھ سکتا مرزا بیدل علیہ الرحمۃ لذت سکون کے اس قدر دلدادہ ہیں کہ ان کو جنبشِ نگاہ تک گوارا نہیں ؎

نزاکت ہاست در آغوش مینا خانۂ حیرت
مژہ برہم مزن تا نشکنی رنگ تماشا را

اور میر مینائی مرحوم یہ تعلیم دیتے ہیں کہ

دیکھ جو کچھ سامنے آ جائے منہ سے کچھ نہ بول
آنکھ آئینے کی پیدا کر دہن تصویر کا

مغربی اقوام اپنی قوت عمل کی وجہ سے تمام اقوام عالم میں ممتاز ہیں اور اسی وجہ سے اسرار زندگی کو سمجھنے کے لئے اُن کے ادبیات و تخیلات اہل مشرق کے واسطے بہترین راہ نما ہیں اگرچہ مغرب کے فلسفہ جدید کی ابتدا ہالینڈ کے اسرائیلی فلسفی کے نظام وحدت الوجود سے ہوئی ہے لیکن مغرب کی طبائع پر رنگ عمل غالب تھا۔ مسئلہ وحدت الوجود کا یہ طلسم جس کو ریاضیات کے طریق استدلال سے پختہ کیا گیا تھا۔ دیر تک قائم نہ رہ سکتا تھا سب سے پہلے جرمنی میں انسانی انا کی انفرادی حقیقت پر زور دیا گیا۔ اور رفتہ رفتہ فلاسفۂ مغرب بالخصوص حکمائے انگلستان کے عملی ذوق کی بدولت اس خیالی طلسم کے اثر سے آزاد ہوگئیں۔ جس طرح رنگ و بو وغیرہ کے لئے مختص حواس ہیں اسی طرح انسانوں میں ایک اور حاسّہ بھی ہے جس کو "حس واقعات" کہنا چاہئے ہماری زندگی واقعات گرد و پیش کے مشاہدہ کرنے اور ان کے صحیح مفہوم کو سمجھ کر عمل پیرا ہونے پر منحصر ہے مگر ہم میں سے کتنے ہیں جو اس وقت سے کام لیتے ہیں جس کو میں نے "حس واقعات" کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے؟ نظام قدرت کے پُراسرار بطن سے واقعات پیدا ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے مگر بیکن (BACON) سے پہلے کون جانتا تھا کہ یہ واقعات حاضرہ جن کو نظریات کے دل دادہ فلسفی اپنے تخیل کی بلندی سے نگاہ حقارت سے دیکھتے ہیں اپنے اندر حقایق و معارف کا ایک گنج گراں مایہ پوشیدہ رکھتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ انگریزی قوم کی عملی

نکتہ رسی کا احسان تمام دنیا کی قوموں پر ہے کہ اس قوم میں "حس واقعات" اور اقوام عالم کی نسبت زیادہ تیز اور ترقی یافتہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی دماغ یافتہ "فلسفیانہ نظام" جو واقعاتِ متعارفہ کی تیز روشنی کا متحمل نہ ہو سکتا ہو انگلستان کی سرزمین میں آج تک مقبول نہیں ہوا۔ پس حکمائے انگلستان کی تحریریں ادبیات عالم میں ایک خاص پایہ رکھتی ہیں اور اس قابل ہیں کہ مشرقی دل و دماغ ان سے مستفید ہو کر اپنی قدیم فلسفیانہ روایات پر نظرِ ثانی کرے۔

یہ ہے ایک مختصر خاکہ اس مسئلے کی تاریخ کا جو اس نظم کا موضوع ہے۔ میں نے اس دقیق مسئلے کو فلسفیانہ دلائل کی پیچیدگیوں سے آزاد کر کے تخیل کے رنگ میں رنگین کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ اس کی حقیقت کو سمجھنے اور غور کرنے میں آسانی پیدا ہو۔ اس دیباچہ سے اس نظم کی تفسیر مقصود نہیں محض ان لوگوں کو نشانِ راہ بتانا مقصود ہے جو پہلے سے اس عسیر الفہم حقیقت کی دقتوں سے آشنا نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ سطور بالا سے کسی حد تک یہ مطلب نکل آئے گا۔ شاعرانہ پہلو سے اس نظم کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ شاعرانہ تخیل محض ایک ذریعہ ہے اس حقیقت کی طرف توجہ دلانے کا کہ لذتِ حیات انا کی انفرادی حیثیت اس کے اثبات استحکام اور توسیع سے وابستہ ہے یہ نکتہ مسئلۂ حیات مابعد الموت کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے بطور ایک تمہید کے کام دے گا۔ ہاں لفظ خودی کے متعلق ناظرین کو آگاہ کر دینا ضروری ہے کہ یہ لفظ اس نظم میں بہ معنیٰ "غرور" استعمال

نہیں کیا گیا جیسا کہ عام طور پر اُردو میں مستعمل ہے۔ اس کا مفہوم محض احساس نفس' یا "تعینِ ذات" ہے مرکب لفظ بے خودی میں بھی اس کا یہی مفہوم ہے اور غالباً محسن تاثیر کے اس شعر میں بھی لفظ خودی کے یہی معنی ہیں۔

غریقِ قلزمِ وحدت دم از خودی نہ زند
بود محال کشیدن میانِ آب نفس

مطبوعہ
زین محمدی پریس سرکلر روڈ لاہور
شائع کردہ
سیّد محمد شاہ، ایم اے پرنٹر پبلشر از دفتر اقبال اکیڈمی
ظفر منزل تاج پورہ
لاہور

بار دوم   مئی سنہ ۱۹۴۴ء   ایک ہزار

سلسلۂ مطبوعات اقبال اکیڈمی

ہمارے ہندستانی مسلمان—
ولیم ہنٹر' آئی۔سی۔ایس ... ۲/۱۲/۰

اقبال پر ایک نظر—
مولانا ظفر علی خاں وغیرہ ... ۱/۸/۰

تعلیمات اقبال—
پروفیسر محمد یوسف خاں سلیم چشتی ... ۱/۸/۰

یاد اقبال—
غلام سرور فگار ۱/۸/۰

اسلامی پارٹی کا آئین—
عزیز ہندی ۱/۸/۰

اقبال کا تصور زمان و مکان—
ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی' ایم۔اے' پی۔ایچ۔ڈی ۱۰/۰

اقبال کے چند جواہر ریزے—
خواجہ عبدالحمید' ایم اے ۰/۱۰/۰

اشتراکیت اور اسلام—
مولوی محمد مظہرالدین صدیقی' بی۔اے ... ۰/۶/۰

موت وحیات اقبال کے کلام میں—
ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی' ایم اے' پی۔ایچ ڈی ۰/۴/۰

شرح اسرار خودی—
پروفیسر محمد یوسف خاں سلیم چشتی ... ۱/۸/۰

حقیقت نفاق—
مولانا صدرالدین اصلاحی ۱/۸/۰